جملہ حقوق غیر محفوظ

(طنز و مزاح)



انور احمد علوی

جملہ حقوق غیر محفوظ

(طنز و مزاح)

انور احمد علوی

اساس پبلی کیشنز
عائشہ منزل، اردو بازار، کراچی

پہلی اشاعت : جون 1996ء
دوسری اشاعت : جنوری 2007ء
تیسری اشاعت : اگست 2008ء
کمپوزنگ : لیزر پلس، فون: 2751324
قیمت : 50 روپے

اساس پبلی کیشنز
عائشہ منزل، اردو بازار، کراچی

والد مرحوم کے نام

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے
اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آوے

کہتی ہوں سچ گو کہ یہ "عادت" نہیں مجھے!

(سرٹیفکیٹ)

میں تصدیق کرتی ہوں کہ میں نے (بیوی ہونے کے باوجود) اس کتاب کو کئی بار بہت غور اور انہماک سے پڑھا (تاکہ اپنے شوہر کی کوئی غلطی پکڑ سکوں)، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسودہ تصحیح کرانے کے بعد، اصلاح کے لیے مجھے دیا گیا ہے، ورنہ ہمارے ہاں کتابت کا معیار ابھی اتنا بلند نہیں ہوا۔ ہو سکتا ہے، کوئی لفظ یا نقطہ دورانِ طباعت غائب ہو جائے (جس کے لیے پرنٹر کی ممنون ہوں گی)۔

(ثروت علوی)

اہم نوٹ: بیوی سے تصدیق کرانے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ دوسرے لوگوں میں مروّت ہوتی ہے! نیز اس پر اس روایتی سرٹیفکیٹ کا گمان ہرگز نہ کیا جائے، جو عموماً عربی کتب کے شروع میں زیر، زبر، پیش کی متعدد غلطیوں کی موجودگی کی تصدیق کے لیے کسی فرضی نام سے چھاپ دیا جاتا ہے۔

(مصنف)

☆۔ یہ مصرع کسی مشہور مزاح نگار کی کتاب سے لیا گیا ہے۔

خیالِ خاطرِ احباب...

اِس کتاب سے کسی کی دل شکنی ہوتو اپنے کم زوردل کے ByPass کا خیال کرتے ہوئے ،ہمیں معاف کردے ،اور ذہن پر ہرگز بوجھ نہ ڈالے ،اور نہ ہی اپنی موجودہ حالت کو سنوارنے کی فکر کرے۔

یاد رکھیے،طنز کو اصلاح کی نیت سے پڑھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی تعلیمی ادارے میں علم حاصل کرنے کی غرض سے داخلہ لینا!

(مصنف)

آئے ہیں غیب سے، یہ مضامیں خیال میں

انور علوی کے انشائیے

انور علوی اپنے انشائیوں کا مجموعہ ''جملہ حقوق غیر محفوظ'' کیا دے گئے کہ یادوں کا پٹارہ کھول گئے۔ ''اخبارِ خواتین'' نے اپنی عمرِ عزیز کے تیس برسوں میں جہاں ملک کی خواتین کو اپنے حقوق سے آ گہی دی، حالاتِ حاضرہ کے مطابق رہن سہن سکھایا، مختلف فنون کی تربیت دی، اطلاعات اور تفریحات مہیا کیں، وہاں کئی لوگوں میں لکھنے کا ذوق بھی پیدا کیا اور نئے لکھنے والوں کے مضامین، افسانے، انشائیے، کالم وغیرہ شائع کر کے ان کی ہمت افزائی کی اور نام دیا۔ ان میں سے جو اپنے ماضی پر شرمندہ نہیں ہیں، وہ آج بھی ''اخبارِ خواتین'' کی اس خدمت کا ذکر احترام سے کرتے ہیں اور اپنی کاوشوں میں اس کے حصے کا اعتراف کرتے ہیں۔

قمر علی عباسی نے اپنے سفرنامے لکھنے کی ابتدا ''اخبارِ خواتین'' سے کی۔ ڈاکٹر یونس بٹ کے مزاحیہ کالم بھی سب سے پہلے اخبارِ خواتین نے شائع کیے۔ انور علوی کے انشائیے بھی پہلی بار ''اخبارِ خواتین'' کے صفحوں کے ذریعے قارئین تک پہنچے، اور آج جب انھوں نے اپنے انشائیوں کو یکجا کیا ہے تو اخبارِ خواتین کی خدمات کے اعتراف میں اپنے انشائیوں کے مجموعے کو میری میز پر لا کر رکھا ہے کہ میں ہی اس پر تبصرہ کروں۔

زیرِ نظر کتاب کے تقریباً تمام انشائیے ''اخبارِ خواتین'' میں شائع ہو چکے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ مصنف نے ان کو کتابی صورت دیتے وقت کچھ حصے کاٹ چھانٹ دیے ہیں، اور یہ کام خوبی سے کیا ہے۔ اس سے نفسِ مضمون متاثر نہیں ہوا، بلکہ بیان میں مزید کارروائی پیدا ہوئی ہے۔

انور علوی ایک بینک میں آفیسر ہیں۔ انھوں نے 1972 سے لکھنا شروع کیا۔ ان کا سب سے پہلا مضمون ''سفر ہے شرط'' سینٹرل گورنمنٹ کالج نمبر 1 اسلام آباد (موجودہ فیڈرل گورنمنٹ کالج، ایچ ایٹ، اسلام آباد) کے میگزین ''اکادمیکا'' میں شائع ہوا۔ ''نیا انداز'' کے نام سے مارچ 1976 میں اسلام آباد سے ایک پرچہ بھی نکالا، جو طلبہ میں کافی مقبول ہوا، لیکن بوجوہ مالی مشکلات بند ہو گیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ٹیلی وژن کے مشہور مزاحیہ پروگرام ''ففٹی ففٹی'' کے لیے خاکے بھی تحریر کیے۔

انور علوی کی تحریر سادہ ہے، ہلکے پھلکے انداز میں اچھے جملے چست کر جاتے ہیں۔ مزاح میں پھکڑ پن نہیں ہے، نہ ہی کسی کی دل آزاری کا پہلو نکلتا ہے۔ ان کے انشائیے پڑھتے وقت ذہن میں شفیق الرحمٰن کے مزاح کا عکس آتا ہے۔

شمیم اختر

ایڈیٹر اخبارِ خواتین

20/مارچ 1996

جملہ حقوق غیر محفوظ!

(نام اور مقام کی مطابقت محض اتفاقیہ سمجھی جائے)

قارئین! مت چونکیے، یہ ایک مزاحیہ کتاب کا اسمِ گرامی ہے، جس کے والدِ محترم جناب انور احمد علوی ہیں۔ عام طور پر کتابوں کے دوسرے صفحے پر ''جملہ حقوق محفوظ ہیں'' والا جملہ دیکھنے اور پڑھنے کو ملتا ہے، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص ناشرِ کتاب کی اجازت کے بغیر یہ کتاب شائع نہ کر سکے، لیکن بعض ناشرین کا پیشہ ہی جعلی ایڈیشن شائع کرنا ہوتا ہے، بھلا ایسے لوگ اس جملے کا کیا نوٹس لیں گے۔ انور احمد علوی صاحب کی یہ کتاب ''جملہ حقوق غیر محفوظ'' کے عنوان سے آراستہ ہے، یعنی جعلی ایڈیشن چھاپنے کی کھلے عام اجازت ہے۔ آج کے دور میں جب کہ ہر بڑا چھوٹا حقوق محفوظ رکھنے یا حقوق مارنے کی تگ و دو میں مصروف ہے، حق کو غیر محفوظ رکھنے کی جرأت کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ ہمیں مصنف کا نام کچھ جانا پہچانا سا لگا، ہم نے اپنے ضعیف حافظے پر زور ڈالا تو اُس نے بتایا کہ ''سفیرِ اُردو'' لندن میں آپ کا ایک خوب صورت انشائیہ شائع ہوا تھا۔ یہ انشائیے کی خوب صورتی ہی تھی کہ انور صاحب کا نام ذہن کے کسی کونے میں محفوظ رہ گیا۔

مصنف کی یہ پہلی کتاب ہے، گویا عالمِ مصنفین میں داخلے کا ٹکٹ ہے۔ اگر چہ مصنف کی اور دو کتابیں اشاعت کے مراحل سے گزر کر قرات کے مراحل میں داخل ہو چکی ہیں، لیکن اِس پہلی کتاب کے تیور ہی کچھ اور ہیں۔ اس کتاب میں شامل زیادہ تر مضامین ''اخبارِ خواتین'' میں شائع ہو چکے ہیں، نہ صرف شائع ہوئے ہیں، بلکہ پسندیدگی کی نظروں سے دیکھے گئے ہیں۔ ہمارے احباب کہتے ہیں (ہم بھی اس خیال کے حامی ہیں) کہ خواتین جس چیز پر اپنی پسند کا لیبل چسپاں کر دیں، اس کے بارے میں کچھ کہنا، اپنی عافیت برباد کرنا ہے۔ جناب انور اپنی تحریروں میں دل چسپی پیدا کرنے کے فن سے بخوبی واقف ہیں، اندازِ بیان بڑا تیکھا ہے، خصوصاً جہاں ان کا قلم طنز کی گولیاں برساتا ہے تو اس کی جولانی لائقِ دید ہوتی ہے۔ ان کی تحریریں مثبت اندازِ فکر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس کتاب میں، میں نے طنز کی کڑواہٹ زیادہ محسوس کی ہے۔ میاں انور کہیں کہیں بڑے چلبلے جملے کہہ جاتے ہیں کہ جن سے دیر تک پیٹ میں گدگدیاں سی ہوتی رہتی ہیں اور ہونٹ آمادۂ تبسم رہتے ہیں۔ پاکستان کی سرزمین مزاح کے لیے بڑی زرخیز ہے (لیکن ہم اس کا سبب بیان نہیں کریں گے)۔ علوی صاحب کی بقیہ دو کتابوں کے نام پہلی کتاب کی طرح ادیب و غریب ہیں، یعنی ''مس گائیڈ'' اور ''سود کے تعاقب میں''، تین کتابوں کے مصنف بن کر انور صاحب نے قانونِ ضبطِ ولادت کی خلاف ورزی کی ہے، لیکن ہندوستانی حکومت انور صاحب کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، کیوں کہ ہندوستان میں ہم کئی ایسے صاحبان سے واقف ہیں، جو ستر سے زائد کتابوں کے والدِ محترم بن چکے ہیں اور

حکومت نے ان سے کوئی مواخذہ نہیں کیا ہے۔

سرورق کی یہ تحریر شگفتگی کا خوش گوار احساس دلاتی ہے:

''اس کتاب کے جملہ حقوق بحق مصنف غیر محفوظ ہیں، نام مقام اور کردار اصلی ہیں (صرف مصنف نقلی ہے) اسی لیے کسی بھی قسم کی کوئی مطابقت محض دانستہ ہوگی، جس کے لیے مصنف ذمہ دار ہوگا۔''

اس تحریر کے پیشِ نظر ہونا یہ چاہیے تھا کہ ہر ناشر اس کتاب کو مالِ مفت کی طرح شائع کرنا شروع کردے، لیکن اُردو کے ناشرین آج کل ادب کی کتابیں شائع کرنا وقت اور قوم کا نقصان سمجھتے ہیں۔ ادبی کتابوں کی جگہ ''قانونِ مباشرت'' جیسی کتابیں نفع آور ہیں۔ مقدمے میں مصنف کا یہ جملہ بھی پڑھنے کے لائق ہے۔''زیرِ نظر مضامین جو ملک کے تمام چھوٹے بڑے رسائل واخبارات میں شائع نہیں ہوتے رہے ہیں، آخر کار خواتین کے ایک ہفت روزہ جریدے میں شہ سرخیوں اور معاوضے کے ساتھ چھپنا شروع ہوئے (اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان مضامین میں عقل کی کوئی بات نہیں)، لہٰذا وہ مرد بھی جو عورتوں کے شانہ بشانہ چلنے کے قائل ہیں، انھیں باآسانی پڑھ سکتے ہیں۔''

ہوسکتا ہے کہ انور صاحب کے اس بیان کو آپ مبالغے پر محمول کریں، لیکن ہم آپ کو ایک شریف قاری ہونے کے ناطے یہ یقین دلاتے ہیں کہ مصنف نے مبالغے سے بالکل کام نہیں لیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ان مضامین میں عقل کی کوئی بات نہیں، کیوں کہ پوری کتاب ہم لفظ بلفظ پڑھنے کی غلطی کرچکے ہیں، اور اپنے آپ کو عقل مند ثابت کرنے کے لیے ہم مصنف کے اس بیان کو جھٹلانا مناسب نہیں سمجھتے (یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ عقل مند آدمی ہی دوسرے عقل مند کی بات سے اختلاف کرنے کی جرأت کرسکتا ہے، بے وقوف نہیں!)۔ چچا غالب پر ایک طرف تحقیق کے نام پر نئے نئے شوشے چھوڑے جارہے ہیں، تو دوسری طرف مزاحیہ شعرا کو جانے کیا سوجھی کہ کلامِ غالب کے بخیے بقدرِ استطاعت ادھیڑنے میں مصروف ہیں، ایسے میں انور صاحب تن من دھن سے خطوطِ غالب کی پیروڈی کرنے میں مصروف ہیں۔

یہ کتاب 112 صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی قیمت 98 روپے کچھ بری نہیں ہے، کہ اس کا کاغذ اور سرورق بہت عمدہ ہے، مواد کی عمدگی کی ہم ضمانت نہیں لیتے، ہوسکتا ہے کہ یہ کتاب کلامِ غالب سے زیادہ لذیذ ترین ہو، یا ہوسکتا ہے کہ...

محمد ظہیر الدین دانش

H.No.8/209-5

Al-maspet, Usman Nagar, KADAPA.516110 (A.P)

INDIA

28-6-2005

نظیر صدیقی کے دو خط

(۱)

عزیز مکرم، سلام و دعا

امید ہے کہ میرا خط رسید کے طور پر آپ کے پاس پہنچ گیا ہوگا۔ میں آپ کی کتاب پر شروع سے آخر تک ایک سرسری نظر ڈال گیا اور املا کی ایک آدھ غلطی نظر آئی تو اسے درست کر دیا مثلاً پڑھے لکھے لوگ بھی طبعیات لکھتے ہیں جب کہ طبیعیات لکھنا چاہیے۔

تعجب ہے کہ آپ کی طالب علمی کے زمانے میں آپ کا جوہر مجھ سے پوشیدہ کیوں رہا؟ بہر حال واقعہ یہ ہے کہ آپ نے طبیعت بہت زرخیز پائی ہے اور آپ کے اندر مزاح نگاری کی صلاحیت فطری ہے۔ آپ مضمون نگاری کی بجائے کتاب نگاری کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ آپ دورِ حاضر کے مشہور مزاح نگار مشتاق یوسفی کو پڑھ کر ان سے inspiration حاصل کر سکتے ہیں۔

آپ کی اس کتاب کا انشائیے کی صنف میں اس لیے شمار نہیں ہو سکتا کہ انشائیہ ہمیشہ مضمون کی شکل میں لکھا جاتا ہے۔ اگر آپ کو انشائیہ نگار نہ کہا جائے تو اِس میں آپ کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ آپ بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں اور مزاح نگاری ادب کی کسی بھی صنف میں ہو سکتی ہے۔ ناول میں، ڈرامے میں، شاعری میں۔ مارک ٹوئین اور چارلس ڈکنس دنیا کے بڑے ناول نگاروں میں ہیں۔ ان کی مزاح نگاری ناول میں نظر آتی ہے۔ برنارڈ شا دنیا کے بڑے ڈراما نگاروں میں تھا۔ اس کی مزاح نگاری ڈرامے میں ہے۔ غالبؔ اور اقبالؔ اُردو کے عظیم شاعروں میں سے ہیں اور سنجیدہ شاعروں میں سے ہیں، لیکن ان کے اندر مزاح کی جو حس تھی، وہ ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔

میری مختصر رائے حاضر ہے۔ اگر اچھی لگے تو کتاب میں شامل کریں، ورنہ اسے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیں، غیر پسندیدہ چیزوں کی صحیح جگہ ردّی کی ٹوکری ہے۔

اس پیکٹ کی رسید فوراً بھیجیے تاکہ اطمینان حاصل ہو جائے کہ پیکٹ آپ کو مل گیا۔

ہاں، ایک گزارش۔ میرے پاس کوئی ایسی چیز نہ بھیجیے جسے واپس کرنے کی دردِسری سے دوچار ہونا پڑے۔ سن رسیدہ آدمی ہوں۔ بہت سی زحمتیں اب اپنے بس کی نہیں۔ آپ کا مشغلہ کیا ہے؟ اپنی تصویر ضرور بھیجیے تاکہ پہچان سکوں۔

خیریت کا طالب
نظیر صدیقی

اسلام آباد

3/اپریل 1996ء

(2)

عزیز مکرم انور علوی

کل تمھاری خوب صورت کتاب موصول ہوئی۔ تمھاری اس طویل خاموشی کے دوران کئی مرتبہ یہ سوال میرے ذہن میں پیدا ہوا کہ تم آخر کہاں غائب ہوگئے۔ کتاب کی طباعت بڑی مصروفیت کا معاملہ ہے۔ یقیناً تم طباعت سے متعلق امور میں مصروف رہے۔ کتاب کی طباعت پر دلی مبارک باد۔

اس کتاب میں ہر بات عام روایت کے برعکس ہے۔ اس کے جملہ حقوق کا غیر محفوظ ہونا، مقام اور کردار کے فرضی ہونے کی بجائے اصلی ہونا، قیمت کا 100 روپے کی بجائے 98 روپے ہونا وغیرہ۔

کتابت کی صحت کی سند بیوی سے لے کر پیش کرنا بھی خوب ہے۔ عورتیں، بالخصوص بیویاں، شوہروں کے کاموں میں عیب جوئی کی ماہر ہوتی ہیں۔ ایک لطیفہ ہے کہ ایک صاحبِ کرامات پیر کی بیوی ان کی قائل ہوتی ہی نہیں تھیں۔ آخر پیر صاحب نے فیصلہ کیا کہ کوئی ایسی کرامت بیوی کو دکھائی جائے کہ ان کے لیے قائل ہو جانے کے سوا چارہ نہ رہے۔ چناں چہ ایک دن اپنی روحانی قوت سے اڑ کر گھر کے اندر داخل ہوئے اور دو ایک منٹ اڑ کر واپس چلے گئے۔ اس کے بعد گھر میں داخل ہوئے تو بیگم نے کہا، ''ارے بدنصیب تم کہاں تھے۔ ایک ولی اڑتے ہوئے آئے تھے، فوراً چلے بھی گئے۔ ولی ایسے ہوا کرتے ہیں؟'' پیر صاحب نے کہا، بیگم تم نے غور ہی نہیں کیا، وہ تو ہمیں تھے۔'' اس پر بیگم نے تبصرہ فرمایا، ''جبھی تو کچھ ٹیڑھے ٹیڑھے اُڑ رہے تھے۔''

اسد اریب سے تمھاری ملاقات زندگی کے کس راستے پر ہوگئی؟ وہ ایک مزاح نگار کے لیے نہایت عمدہ موضوع ہیں!

ڈاکٹر صدیق شبلی کے لیے ایک جلد میرے پتے پر بھیج دو تو بہتر۔ کتاب جو نذر کی جاتی ہے، اُس پر دو چار الفاظ لکھ دینے میں کوئی حرج نہیں۔

اپنی خیریت اور کوائف سے مطلع کرتے رہو۔

خیر طلب

نظیر صدیقی

اسلام آباد

27 اگست 1996ء

دروغ بر گردنِ راوی!

عموماً مزاح نگاری ایک مشکل فن سمجھا جاتا ہے۔ اگر قلم پر قدرت نہ ہو تو مزاح پھکڑ پن میں تبدیل ہو جاتا ہے، لیکن انور علوی کے قلم میں یہ کمزوری موجود نہیں ہے۔ وہ بڑی شائستگی سے حالات و واقعات سے مزاح کا پہلو برآمد کر لیتے ہیں۔

روزنامہ نوائے وقت

بینک کاری کا شعبہ اپنی حسابی خشکی کے لیے معروف ہے۔ کتابی طراوت اس شعبے سے عنقا ہے، لیکن پھر خدا کی تخلیقی کبریائی جوش میں آئی تو اس شعبے سے مشتاق احمد یوسفی کو ابھار دیا۔ خوشی ہوئی کہ بینکنگ کے شعبے سے ایک اور مزاح نگار ابھر آیا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید

انور احمد علوی طنز، تحریف، ذہانت، برجستہ گوئی اور شگفتہ نگاری سے حسبِ توفیق کام لیتے ہیں اور غریب قاری کو بھونچکا کر دیتے ہیں۔ اُن کے اندازِ بیان میں غیر معمولی تیزی اور کاٹ ہے۔ بہت معمولی اور پیش پا افتادہ بات بھی اُن کے ہاں ایک نئی اور گہری معنویت کی حامل نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

انور احمد علوی کی کتاب ''جملہ حقوق غیر محفوظ'' میرے پاس ایک خوش گوار حیرت کے طور پر آئی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ ان کی ذات میں اُردو ادب کو ایک بے ساختہ مزاح نگار مل رہا ہے۔ وہ بڑی زرخیز طبیعت کے مالک نظر آتے ہیں۔ ان کی مزاح نگاری، مضمون نگاری پر قناعت کرتی نظر نہیں آتی۔ ان کے اندر sustained humour لکھنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

نظیر صدیقی

طنز و مزاح وہ ادبی صنف ہے جو لکھنے والے کے بس میں آسانی سے نہیں آتی۔ اُردو میں طنز و مزاح کی روایت خاصی پرانی ہے۔ اس مضبوط روایت میں کچھ اور نام بھی شامل ہو رہے ہیں۔ انور احمد علوی کا نام بھی اسی سلسلے میں لیا جا سکتا ہے۔ ان کی تحریر میں بناوٹ اور سجاوٹ کے بجائے بے ساختگی اور روانی ہے۔ وہ بظاہر ہلکے سے، بلکہ چپکے سے اپنی بات کہتے ہیں، لیکن پڑھنے والا زیرِ لب مسکراتا ہے اور کچھ پاتا ہے۔ انور احمد علوی الفاظ کے ہیر پھیر سے مزاح پیدا نہیں کرتے، بلکہ واقعات کے مضحک پہلوؤں کو سامنے لا کر قاری کی تواضع کرتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ دوسروں کی (مثلاً بیوی کی) زبان سے اپنے آپ پر طنز بھی کرتے ہیں، جو ایک مشکل کام ہے، مگر اس سے تحریر میں جان پڑ جاتی ہے۔ ان سے اُردو کا مزاحیہ ادب اچھی امیدیں باندھ سکتا ہے۔

مسعود احمد برکاتی

انور احمد علوی پیشہ ور قلم کار نہیں ہیں، لیکن انھیں تحریر و اظہار پر مکمل عبور حاصل ہے۔ اندازِ تحریر منفرد اور انتہائی دل کش اور دل چسپ ہے۔ بات سے بات نکالنے اور بال کی کھال نکالنے کا فن بخوبی جانتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں شگفتگی کے ساتھ گہرا طنز اور معاشرے کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں حقائق بھی جلوہ گر ہیں، جو کہ ان کے گہرے مطالعے، ذوقِ لطیف اور مشاہدے کا نچوڑ ہیں۔ انھوں نے روزمرہ کے معمولی موضوعات کو اچھوتے انداز سے پیش کر کے ان میں بھی رنگینی اور معنویت پیدا کر دی ہے۔ اُردو ادب میں معیاری طنز و مزاح کا رواج کچھ کم ہوتا نظر آتا ہے، لیکن انور احمد علوی کی تحریروں سے اس تشویش کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

علی سفیان آفاقی

تازہ واردانِ بساطِ طنز و مزاح میں نثر کے حوالے سے انور احمد علوی اپنے لیے جگہ بناتے نظر آتے ہیں۔

علی حیدر ملک

طنز و مزاح درحقیقت مشکل کام ہے اور اس کی مشکلات کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انشا اللہ خان انشا جیسا طباع، شگفتہ مزاج، بذلہ سنج، حاضر جواب ہفت زبان شاعر اور انشا پرداز، اسی دو دھاری تلوار پر چل کر گھائل ہوا۔ اب کسی دوسرے کا اس پلِ صراط سے بخیر و خوبی گزر جانا، خود دلیلِ کمال ہے۔

ڈاکٹر ابراہیم خلیل نقوی

انور علوی کی شوخیہ تحریریں، زندگی کی ناہمواریوں کا خاکہ ہیں۔ جہاں کہیں وہ سنجیدہ بھی ہے، وہ سنجیدگی بھی اس کی شوخی کا شاخسانہ ہے۔ اس دور کے بیشتر نوجوانوں نے آنکھیں بند کر لی ہیں اور منہ کھول لیے ہیں، بغیر مشاہدے کے جو منہ میں آتا ہے کہے جاتے ہیں، لیکن انور علوی ظاہر کی آنکھ اور باطن کی بصیرت، دونوں اعتبار سے چوکس ہے۔

ڈاکٹر اسد اریب

انور احمد علوی کا اندازِ تحریر سبک، رواں اور بے ساختہ ہے، جس میں مزاح اور طنز کی چاشنی بڑی چابک دستی سے شامل کی گئی ہے۔

امین جالندھری

ہنسانے کا کھیل انور علوی نے سلیقے سے سیکھا ہے۔

رضی الدین سید

انور احمد علوی کی تحریر سادہ ہے۔ ہلکے پھلکے انداز میں اچھے جملے چست کر جاتے ہیں۔ مزاح میں پھکڑ پن نہیں ہے۔ نہ ہی کسی کی دل آزاری کا پہلو نکلتا ہے۔

ہفت روزہ اخبارِ خواتین

مزاح لکھنا اور اُس میں شائستگی اور ادبیت کا دامن مسلسل تھامے رکھتے ہوئے سب کو ہنسانا، کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے، لیکن انور احمد علوی قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے یہ کھیل بہت سلیقے سے کھیلا ہے۔

ماہنامہ رابطہ

حقیقت یہ ہے کہ علوی کے طنز و مزاح کی کوئی ایک یا چند مثالیں دینا مشکل ہے۔ ان کی تحریر میں قابلِ رشک حد تک پختگی نظر آتی ہے۔

فرائیڈے اسپیشل

ان کی تحریروں میں جو دل کشی، شگفتگی اور سلاست ہے، جو واقعہ بندی ہے، اور وہ کرداروں کا تذکرہ جس طرح سے کرتے ہیں، وہ اس لیے پڑھنے میں دل کشی پیدا کرتا ہے کہ انور علوی لاشعوری طور پر افسانہ نگاری سے کام لیتے ہیں، اور سب جانتے ہیں کہ حقیقت میں اسی وقت جان پڑتی ہے، جب وہ حقیقت افسانوی رنگ میں رنگ جاتی ہے

ماہنامہ تخلیق، لاہور

انور احمد علوی کے حسنِ تحریر کا نمایاں ترین وصف یہ ہے کہ اس کا ڈھانچہ اٹھانے کے لیے کسی قسم کی بیساکھیوں کا سہارا نہیں لیا گیا۔ ان کی زبان غیر ضروری کشیدہ کاری گل پاشی اور قافیہ بندی سے آزاد، عام پڑھے لکھے لوگوں کی زبان ہے، جو از دل خیزد و بر دل ریزد کی تاثیر رکھتی ہے۔ انھوں نے اپنی بات میں مصنوعی طرز کا زور پیدا کرنے کے لیے فرضی کردار تخلیق کرنے اور اپنے مزاح کی بندوقیں داغنے کے لیے ان کے کندھے استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کا مزاح کسی اَن دیکھی دنیا اور کسی قسم کی تجریدی کیفیت سے تعلق نہیں رکھتا۔ انھوں نے یہ جوہر آج کے انسانی معاشرے کی الم دیدہ اور بے سکون زندگی سے کشید کیا ہے۔ ان کا اسلوب اور لہجہ سادہ اور دل نشیں ہونے کی بنا پر قارئین کی قلبی کیفیات سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے قارئینِ ادب کے حسنِ نظر سے بھی گہری مطابقت رکھتا ہے۔

امداد نظامی

The writer has a deep understanding of the classical literature. He also knows the difficult art of playing with words without making it too obvious. His rich exposure to the language and literature shows how comfortably he writes. Not boisterous like many of his contemporaries, Alvi has a fascination for subdued expression of amusing anecdotes. He prefers a mild smile to a roaling laughter.

Humorists and satirists have often been criticized for their extravagance in praising or condemning their subjects. They either exaggerate their virtues beyond all proportions or tear them apart by finding faults with them. But Alvi does not indulge in either. He does not offend anyone by his writing.

Alvi has a flair for humour and satire and also knows the art of practicing it with dignity and decorum.

Akhtar Payami
(The Daily "Dawn" Karachi)

Anwer Alvi does not play with words, nor does he rely much on homorous quotes. By and lage he depends on the ingenuity of his mind, which helps him explore the sordid aspects of things around us and project them in a delightful manner. This, in turn, requires a deep sense of observation and full command over the language, which fortunately he is endowed with. No one should, therefore, feel insulted or humilited for what is said with sincerity of intention and dexterity of diction.

Dr. S.M. Moin Qureshi
(The "Daily News," Karachi)

Satire is humour at somebody`s expense. It sometimes hurts but humour is harmless. It is in a lighter vein. In Urdu literature، we have managed to produce only a handful of writers that have committed themselves to humour. In this scenario if somebody comes up with an interesting discourse of light humour, it being a very difficult genre of literature, then one feels enlightened and encouraged.

In contrast to many others, Alvi does not delibrately create a humuorous situation as a cover up for the crude situations. He is sensitive in his approach and with delicacy not only describes the apathy of the state of affairs of the mundane and bland things but also due to his inborn urge to look at things differently, he creates hurmour. Thus both the people are not hurt and the message in conveyed. At the same time the reader is bound to enjoy the reading.

Not many have come up in the field of Urdu literature writing satire or humour. Azeem Beg Chughtai, Shukat Thanvi and Mushtaq Ahmed Yousufi and only few others have managed to qualify to contribute some wholesome literature in this difficult domain of literature. Alvi perhaps seems to be rubbing shoulders with these giants because of his lively style, spontaneity and easy prose.

Dr. Amjad Parvez
("The Nation", Lahore)

اظہارِ تفکر

کتاب اختتام کو پہنچی تو ہم نے اسے کسی مشہور سیاسی رہنما کی میت کی طرح، دیدارِ عام کے لیے اپنے ڈرائنگ روم میں رکھ دیا، تاکہ آنے جانے والے اس کی شکل دیکھ کر حشر کا کچھ اندازہ لگا کر بتا سکیں۔ کچھ ہی دنوں بعد اس میں سے بو آنے لگی تو تشویش لاحق ہوئی۔ غور کیا تو پتا چلا کہ یہ ناشکری کی بو تھی، کیوں کہ ہم نے اپنے اُن محسنوں کا شکریہ تو ادا ہی نہیں کیا تھا، جنھوں نے وقت کا خیال کیے بغیر اس کی تیاری میں ہمارے ساتھ بے لوث تعاون کیا، لہٰذا کتاب ہٰذا میں اپنی اس فکر کا اظہار ضروری خیال کیا مثلاً اوّل خویش:

عمیر (بیٹا)

اِس نے اصلاح کرتے ہوئے بتایا کہ مارکو پولو سائنس دان نہیں سیاح تھا ورنہ ہم تو اُسے بازار میں ملنے والی بچوں کی میٹھی ٹکیوں POLO کا موجد سمجھ رہے تھے۔

سارہ (بیٹی)

اِس نے ربڑ، پنسل، شارپنر بلینکو حتیٰ کہ بال پوائنٹس تک غائب کر کے اُن کی بازیابی تک مضامین پر غور کرنے کا اچھا خاصا موقع فراہم کیا۔ شاید اسی لیے اس کا اصرار تھا کہ کتاب میں مصنف کی جگہ اس کا نام بھی لکھا جائے، کیوں کہ تحریر میں کام آنے والے جملہ آلات اس دوران ہم سے زیادہ اسی کی تحویل میں رہے۔

سیّدہ ثروت (بیوی)

تین ماہ تک دن اور رات کا خیال کیے بغیر نہ صرف بار بار چائے بنا کر دی، بلکہ اس دوران میں ہمارے حصے کے جملہ کام بھی (خراب کیے۔ کتاب کا مقدمہ اِسی کی حماقتوں کا پیش خیمہ ہے۔ اسلام آباد میں طالب علمی کا آخری زمانہ (انٹرمیڈیٹ سے بی اے تک) اِسی کے ہاں گزارہ، جس کی سزا اب تک بھگت رہے ہیں (مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا)۔ اس کے طفیل اس پورے عرصے میں بچوں پر سختی نہ کر کے گناہ گار ہونے سے بھی محفوظ رہے، کیوں کہ گزشتہ تین ماہ تک ہماری طرح وہ بھی اسی کے زیرِ عتاب رہے!

محترمہ رفعت ہمایوں

ٹیلی وژن کے ہر دل عزیز پروگرام "روپ سروپ"، "یہ جہاں" کی خالق، مشہور ڈرامے "خالہ خیرن" کی مصنف اور Russian Award, "Raduga" پانے والی پہلی بین الاقوامی شہرت یافتہ سالی، خاتون پروڈیوسر اور مزاح نگار جس نے ٹیلی وژن سے آلودگی ختم کرنے کے لیے بھی کئی پروگرام پیش کیے۔

اپنی سخن فہمی کی پاداش میں ہمارے طویل مضامین کو نہ صرف اپنی فرصت کے باعث ٹیلی فون پر سنا، بلکہ اصلاح بھی کی، جب کہ اصلاح کرنا ٹی وی پروڈیوسر کا کام بھی نہیں ہے! اسی لیے اسے محترمہ لکھنا پڑا، ورنہ عمر میں ہم سے نہیں، ہماری بیوی سے بڑی ہے۔ ٹیلی وژن اور "اخبارِ خواتین" تک رسائی اسی کے توسط سے ہوئی (ورنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا تھی)۔ کتاب میں شامل مضامین، رائے جاننے کی غرض سے کئی لوگوں کو سنائے۔ اس کے علاوہ اپنے میاں کو بھی اکثر سناتی رہتی ہے!

ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی کے سیّد عرفان قیصر

متعدد مسائل میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود کتابت اور ٹائٹل کے لیے وسائل دریافت کئے اور پرنٹر و پبلشر کا انتظام کیا۔ ہم دونوں کو انٹر کے امتحان میں ایک ساتھ فیل ہونے کا شرف بھی حاصل رہا ہے!

اور اب بعد درویش:

ویلکم بک پورٹ کے منیجر جناب محمد اقبال اور گولڈن گرافک (پرائیویٹ لمیٹڈ) کے جناب محمد عابد

وقتاً فوقتاً اپنے قیمتی مشوروں سے، بلاقیمت نوازتے رہے۔

جان لیزر کمپوزنگ کے جناب محمد یوسف

بڑی محنت اور محبت سے کتاب کو کمپوز کیا اور کئی بار اس کا حتمی مسودہ (Final Draft) نکال کر دیا۔ بارہا کتاب کو سراہا بھی۔

انٹرنیشنل اسلامک یونی ورسٹی اسلام آباد کے جناب محمد انور کاظم

ہمارے اساتذۂ کرام کے موجودہ پتے ارسال کر کے اُن سے ہم کلام ہونے کی سعادت بخشی۔ ان کا ایک اعزاز یہ ہے کہ وہ کالج میں ہمارے ساتھ ہوتے ہوئے بھی انٹر میں پاس ہو گئے۔

دفتر کے ساتھی سیّد غلام عباس زیدی

کہتے ہیں دفتر میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا، اس لیے کہ ہر کوئی آگے نکلنے کے چکر میں ایک دوسرے کے پیچھے ہوتا ہے، مگر اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا کہ یہ ایک دفتر میں ہوتے ہوئے بھی ہم سے محبت نبھا کر پچھلے بارہ سال سے مسلسل اس مقولے کی نفی کر رہے ہیں۔ اس دوران بھی ہاتھ بٹاتے رہے اور اپنے کام کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے، ہمارا کام نکال کر، شکایت کے بجائے، حاضری لگاتے رہے، وغیرہ وغیرہ۔

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں!

انور احمد علوی

(3-4-1996)

مجھے کس ڈبّے میں ڈالیے؟

(مقدمہ)

پہلے خیال تھا کسی نقاد سے کہہ دیں، ہم مضامین ترتیب دے رہے ہیں، اس اثنا میں وہ مقدمہ لکھ کر بھیج دے، مگر اہلیہ کہنے لگیں، مقدمہ ہمیشہ کسی اچھے وکیل کی وساطت سے لڑنا چاہیے، ورنہ ہار جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ وضاحت کی تو پتا چلا اُن کے سوا ہمیں اور جانتا کون ہے جو تعارف کراتا پھرے گا (اور سچ پوچھیں تو انھوں نے بھی ہمیں شادی کے بعد ہی صحیح طور پر جانا)۔ نیز ہمارا نام کسی تعارف کا ہی نہیں، ان کی تعریف کا بھی ہمیشہ محتاج رہا ہے۔ وہ اس سلسلے میں ضرور مدد کرتیں، لیکن مشرقی عورت کو یہ ہرگز زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے مجازی خدا کی برائی لکھ کر بھی بیان کرے!

ایک صاحب سے اپنی کتاب کے بارے میں رائے طلب کی تو کہنے لگے، یہ مضامین دوستوں کو ہرگز نہ دکھائے جائیں، کہیں بے چارے دل رکھتے ہوئے بے جا تعریف کر کے ہمارا وہ حشر نہ کریں جو عام طور پر خفیہ ایجنسیاں غلط اطلاعات فراہم کر کے سربراہانِ وقت کا کیا کرتی ہیں! اور تجویز کیا کہ مسودہ کسی اپنے کو دکھا دیا جائے (اور اپنوں کی فہرست میں اگر چاہیں تو بیوی کو بھی شامل کر سکتے ہیں)۔ اس طرح مضامین میں چھپی ہوئی خامیوں کے ساتھ ساتھ ہماری ذات میں موجود وہ کمزوریاں بھی منظرِ عام پر آ جائیں گی، جو ایک اچھے انسان میں ہونی چاہییں، مگر عموماً واسطہ نہ پڑنے کی بنا پر نقادوں کی نظر سے اوجھل رہتی ہیں۔ یوں ہمیں اچھا ادیب بننے کے ساتھ ساتھ اچھا انسان بننے میں بھی کافی مدد ملے گی۔ نیز اگر وہ بادلِ نخواستہ بھی تعریف کر دیں (جس کی امید انھیں بہت کم ہے) تو سمجھ لیا جائے کہ مضامین قابلِ اشاعت ہیں، ورنہ وہیں رکھ دیے جائیں، جہاں پچھلے بیس سال سے رکھے ہوئے تھے۔

ان کو کیا معلوم کہ جگہ کی قلت ہی تو اس کتاب کی اشاعت کا اصل سبب ہے اور اہلیہ کئی بار اپنی الماری کی دراز خالی کرنے کی دھمکی دے چکی ہیں۔ ایک روز تو انھوں نے یہاں تک پیش کش کر دی کہ اگر ہم کسی وجہ سے مصروف ہیں تو وہ صرف ہماری خاطر یہ کام بچوں سے کرانے کو تیار ہیں۔ انھوں نے فلیٹ کے باہر سڑک پر بے کار کاغذوں کے لیے ایک ہرے سے رنگ کا ڈبا لگا دیکھا ہے، بچے ان تمام کاغذوں کو ادب سے اس میں ڈال آئیں گے! اس کے علاوہ انھوں نے ’’USE ME‘‘ لکھے ہوئے ڈبے بھی بازاروں اور پارکوں میں بارہا دیکھے ہیں، وہ بھی اس کام کے لیے خاصے موزوں ہیں۔ ان حالات میں مسودے کو واپس الماری میں رکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چوں کہ ہمیں ’’اپنوں‘‘ اور ’’اپنی‘‘ سے تعلقات زیادہ عزیز تھے، اس لیے ان مشوروں پر عمل کرنے اور مقدمے کے چکر میں پھنسنے کے بجائے اپنے بارے میں دو چار سطریں از خود لکھنے کو ترجیح دی۔

جائے پیدائش

گھر میں پیدا ہوئے۔

تاریخِ پیدائش

یاد نہیں، چوں کہ اس وقت ہم بہت چھوٹے تھے۔

عمر

اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ کتنی ہوگی۔

زبان

اپنی زبان پر قائم رہتے ہیں۔

تعلیم وتربیت

بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا خیال ہے۔اس کے علاوہ ہم نے صبر وقناعت کا درس اپنی والدہ سے، رشتہ داریاں نبھانا، اپنے والد سے اور طنز کرنا اپنی اہلیہ سے سیکھا ہے!

ذریعۂ معاش

بینک میں آنے سے پہلے بھی ایک بینک میں ہی ملازم تھے۔

تجربہ وقابلیت

1977 سے 1995 یعنی 18 ر سال تک دو بینکوں میں ایک ہی درجے میں کام کرتے رہنا ہی ہماری اہلیت کا منھ بولتا ثبوت ہے (اپنے منہ میاں مٹھو کیا بننا)۔اس نسبت سے سرور بارہ بنکوی کے مقابلے میں انور دو بنکوی کہلائے جانے کے بھی مستحق ٹھہرے۔

خوراک

دو گولیاں اور آدھا چمچہ معجون صبح نہار منہ اور شام 5 ر بجے، ہمراہ عرقِ گاؤزبان اور ایک چمچہ خمیرہ رات کو سوتے وقت، سادہ پانی کے ساتھ۔

معاشی حالات

مقروض رہنے کے باوجود، پچھلے سترہ سال سے شمار اہلِ ثروت میں ہی ہوتا ہے (کیوں کہ اہلیہ کا نام ثروت ہے)۔

تعلقاتِ عامہ وازدواجی زندگی

عام لوگوں اور رشتہ داروں سے تعلقات انتہائی خوش گوار ہیں، مگر امارت کی طرح اس کا سہرا بھی اہلیہ ہی کے سر ہے، کیوں کہ وہ بھی کسی سے نہیں لڑتیں (سوائے ہمارے)۔

زیرِ نظر مضامین جو ملک کے تمام چھوٹے بڑے رسائل واخبارات میں شائع نہیں ہوتے رہے ہیں، آخر کار خواتین کے ایک ہفتہ روزہ جریدے میں شہ سرخیوں اور معاوضے کے ساتھ چھپنا شروع ہوئے (اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان مضامین میں عقل کی کوئی بات نہیں)، الہٰذا وہ مرد بھی جو عورتوں کے شانہ بشانہ چلنے کے قائل ہیں، انھیں بہ آسانی پڑھ سکتے ہیں۔ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتے چلیں کہ ہمیں اُردو زبان وادب سے روشناس

کرانے کے پیچھے ہمارے معزز اساتذہ جناب محمد مقرب خان (میٹرک) ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی (انٹرمیڈیٹ) پروفیسر نظیر صدیقی اور پروفیسر اسد علی خان (بی اے) کا آہنی ہاتھ ہے (واضح رہے کہ بریکٹ میں ان اساتذہ کرام کی تعلیمی قابلیت نہیں، ان جماعتوں کے نام درج ہیں جن میں ہم نے ان سے اُردو کی تعلیم حاصل کی)۔ لکھنے لکھانے کا حوصلہ ڈاکٹر اسد اریب صاحب کے اُن تعریفی کلمات نے بخشا، جو انھوں نے غالباً 1979 میں تحریر کیے تھے۔ مضامین کی پہلی بار اشاعت ''اخبارِ خواتین'' کی ایڈیٹر محترمہ شمیم اختر صاحبہ کے تعاون سے ممکن ہوئی، اور انھیں کتابی شکل میں لانے کی جرأت اہلیہ کا اکاؤنٹ دیکھ کر ہوئی۔ نیز مضامین کے مزاحیہ ہونے کی سند ٹیلی وژن کے مستند پروڈیوسر جناب کاظم پاشا نے، ان سے ماخوذ ہمارے لکھے ہوئے خاکوں کو اپنے مشہور پروگرام ''ففٹی ففٹی'' میں شامل کر کے دی۔

بہ ہر حال کتاب مرتب ہوئی اور book launching کا تذکرہ چلا تو اہلیہ نے یہاں بھی رہنمائی کی کہ لانچ کا خرچہ کرنے کی کیا ضرورت ہے، طباعت کے بعد کتابیں کامران کو دے دی جائیں (ہمارا چھوٹا بھائی، جو نیوی میں ملازم ہے اور اکثر شپ پر رہتا ہے)۔ وہ اپنے اردلی کے ذریعے انھیں ان کی اصل منزل تک پہنچا دے گا!!

یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں!

انور احمد علوی

18 فروری 1966

D-12, Ibrahim Blessings
Block No. 11, Gulshan-e-Iqbal, Karachi- 75300
Tel: +92214616450

جان ہے تو جہان ہے

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے

دونوں نے وزن کیا اور یہ طے پایا کہ ایک ماہ کی مدت میں جس کا وزن اپنے موجودہ وزن سے بڑھ جائے گا، اسے دوسرا ساتھی کھانا کھلائے گا۔ ورزش شروع ہوئی۔ ہم تو خیر اعتدال پر رہے، صبح یا شام جب بھی وقت ملتا تھوڑی بہت کر لیتے، مگر کامی کو تو بس کوئی حیلہ ہاتھ آ جانا چاہیے، پھر وہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ جب دیکھو کبھی ورزش ہو رہی ہے، تو کبھی آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر باڈی بلڈنگ کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ اس دھندے سے فارغ ہوئے تو پہلوانی سے متعلق کوئی کتاب پڑھ لی۔ پھر بھی وقت بچ رہا تو یہ جاننے کے لیے کہ کس چیز میں کون سے حیاتین ہوتے ہیں ہائی جین کی کتاب کا مطالعہ کر لیا۔ غرض اپنا وزن بڑھا کر ہم سے کھانا کھانے کے لیے انھوں نے کوئی طریقہ ہاتھ سے نہ جانے دیا، یہاں تک کہ بستر پر بھی چین سے نہ لیٹتے اور پڑے پڑے ہلتے رہتے کہ اس طرح جسم میں دورانِ خون درست رہتا ہے۔

مدت ختم ہوتے ہی حسبِ وعدہ دونوں مشین پر پہنچے۔ کامی کا وزن پہلے سے پانچ پونڈ کم نکلا اور ہمارا وہی کا وہی۔ اس صورتِ حال پر وہ سخت پریشان ہوئے اور شرط کے مطابق ہوٹل لے گئے۔ واپسی پر ہم نے انھیں سمجھایا کہ انسان حیاتین کے متعلق معلومات حاصل کرنے سے نہیں، ان کے استعمال سے موٹا ہوتا ہے۔ اب تو انھوں نے سب کچھ چھوڑ کر پھلوں اور سبزیوں پر دھاوا بول دیا۔ ہری ہری پیاز، کچی کچی گاجریں، پتلی پتلی مولیاں، سرخ سرخ چقندر، لال لال ٹماٹر اور سبز سبز سلاد ہر وقت ساتھ رہنے لگی۔ خود بھی کچر کچر چباتے اور فوائد گنوا کر دوسروں کے منھ کا ذائقہ بھی خراب کرتے اور متلیاں کراتے۔ فارغ اوقات میں خصوصاً کالج جاتے ہوئے خشک میوے چباتے اور جماعت میں مٹر کے میٹھے میٹھے دانوں کی جگالی کرتے۔ کینٹین میں چائے کے بجائے دودھ منگوا کر پیتے اور بار بار پوچھتے کہ چہرے پر کچھ رونق محسوس ہوئی۔ جب تک ہم اثبات میں اپنا سر نہ ہلا دیتے، گلاس پہ گلاس پیے جاتے۔

ایک روز کسی طرح یہ معلوم ہو گیا کہ لسی، دودھ سے زیادہ مفید ہوتی ہے۔ بس پھر کیا تھا، گھر میں صاف صاف کہہ دیا کہ ان کے حصے کے تمام دودھ کی (جو بمشکل 125 گرام بنتا تھا) دہی جما دیا کریں۔ اب جب بھی کوئی دوست آتا تو وقت اور موسم کا خیال کیے بغیر اسے بھی نمک کی پتلی پانی لسی ہی پیش کرتے۔ شروع میں تو ہر کوئی بہت منھ بناتا، مگر انھیں مسلسل اپنی طرف متوجہ پا کر طوعاً و کرہاً مسکراتے ہوئے گلاس خالی کر دیتا اور یہ خوش ہو کر اسے دوسرے گلاس کی پیش کش کرتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ کامی گلاس لے کر اندر جاتے اور

مہمان چھینکیں مارتا ہوا باہر نکل جاتا۔

ایک بار کامی کے ساتھ دعوت میں جانے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے میزبان سے معدے کی خرابی کے باعث کھانے کے سلسلے میں معذرت چاہی تو مہمانوں میں سے کسی منچلے نے ازراہِ مذاق یہ نسخہ بتا دیا کہ پتھر کی سل اٹھا کر دوڑنے سے معدہ ٹھیک رہتا ہے اور غذا اچھی طرح ہضم ہو کر جزوِ بدن و جزوِ فلش بن جاتی ہے اور وزن بڑھ جاتا ہے۔ عقل کو بالائے طاق رکھ، اگلی ہی صبح اس نسخے پر سنجیدگی سے عمل شروع کر دیا۔ ہم سیر کو جا رہے تھے کہ کامی دونوں ہاتھوں میں سل تھامے تیزی سے گزرے۔ اب تو ان کا یہ روز کا معمول بن گیا۔ راستے میں محصول چونگی پڑتی تھی۔ ایک دن سل اٹھائے دوڑے چلے جا رہے تھے کہ ٹھیکے دار نے روک لیا۔ پہلے تو محصول ادا کیے بغیر سلیں سپلائی کرنے پر کافی سخت سست کہا، پھر زبردستی ایک پرچی کاٹ دی۔

اسی اثنا میں ایک رات چور آ گیا۔ وہ جاگ اٹھے تو چور بھاگ کھڑا ہوا۔ کامی کو سوتے سوتے ورزش کا موقع ہاتھ آ گیا۔ صبح کا انتظار کیے بغیر، اسی وقت لنگوٹ کسا اور ننگے پاؤں گھر سے نکل کھڑے ہوئے، اور اس برق رفتاری سے چور کا پیچھا کیا کہ خود اُس سے آگے نکل گئے۔ چور کو شرارت سوجھی اور اس نے شور مچا کر الٹا ان کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔ آواز سن کر لوگ جمع ہو گئے۔ چور تو فرار ہو گیا، یہ پکڑ لیے گئے۔ سردی کے موسم میں سڑک پر ناکافی کپڑوں میں پا کر پڑوسیوں کو ان کی دماغی صحت پر کچھ شبہ سا ہونے لگا۔ وہ انھیں جلوس کی شکل میں گھر لے آئے اور کسی اچھے معالج سے علاج کرانے کا مشورہ دے کر واپس چلے گئے۔

ورزش کا جنون اپنی آخری حدوں کو چھو رہا تھا کہ اچانک ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ تعزیت کو پہنچے تو دیکھا کامی افسردہ خاطر چھت پر کھڑے سپرنگ کھینچ رہے ہیں۔ انھیں اپنے والد کی موت سے زیادہ ملال اس بات کا تھا کہ انھوں نے ان کے بار بار اصرار کرنے کے باوجود ورزش کو اپنی زندگی کا شعار نہ بنا کر موت کو ترجیح کیوں دی۔ ایک شکایت یہ بھی تھی کہ مرحوم نے صبح سویرے عین اس وقت دم کیوں توڑا جب کہ وہ ورزش کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ شام کو جنازے میں بھی یہ کہہ کر شرکت کرنے سے انکار کر دیا کہ اب جنازہ بھی جان بوجھ کر ان کے ورزش کے اوقات میں اٹھایا جا رہا ہے، اور اس ساری سازش میں کسی بیرونی طاقت کا ہاتھ ہے۔ احباب نے سر پھوڑ لیا، مگر بات ان کی عقل میں نہ آئی۔ آخر کار کچھ لوگوں کے سمجھانے پر کہ جنازہ لے کر چلنا بھی ایک طرح کی ورزش ہی ہے تو، کچھ کچھ تیار ہوئے۔ پھر اچانک اس بات پر اڑ گئے کہ ورزش کا یہ مرحلہ وہ اکیلے ہی طے کریں گے۔ چوں کہ جنازے کو ہر حال میں چار کندھے دیے جاتے ہیں، اور کامی کے پاس اس وقت صرف دو ہی کندھے دستیاب تھے۔ اس لیے کافی بحث و تکرار کے بعد معاملہ کچھ یوں ٹھہرا کہ جنازے کو دو کندھے کامی دیں گے اور دو کندھے دوسرے لوگ، لیکن جب جنازہ اٹھایا گیا تو وہ اپنے ایک کندھے سے ہمارے حق میں دستبردار ہو گئے۔

کچھ دنوں بعد پتا چلا کہ کامی باقاعدہ مسجد جانے لگے ہیں۔ ہم ششدر رہ گئے کہ یہ بیٹھے بٹھائے اس شخص کو آخر کیا ہو گیا ہے، مسلمان ہو کر نماز پڑھتا ہے! فوراً ان کے گھر پہنچے اور اپنی حیرت کا اظہار کیا تو ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ہینڈ پمپ چلانا بڑی اچھی ورزش ہے، جس سے سینہ پھولتا ہے (اور زیادہ چلاؤ تو سانس بھی)، اس لیے انھوں نے محلے کی مسجد میں پانی بھرنے کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔

نیز پہلے وہ پانی بھر کر نماز پڑھے بغیر چلے آتے تھے تو امام صاحب نے ٹوکا کہ جو شخص نماز کی پابندی نہ کرے، وہ مسجد کے امور چلانے کا (خواہ وہ ہینڈ پمپ ہی کیوں نہ ہو) مجاز نہیں، لہٰذا ورزش کی خاطر نماز بھی شروع کرنا پڑی۔ کچھ عرصے بعد کامی کی پابندی کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسجد والوں نے اپنے سقے کو برطرف کر دیا۔ غرض ورزش کے اتنے رسیا ہو گئے تھے کہ وہاں بھی باز نہ آتے اور جب موقع ملتا دو چار ڈنڈ پیل لیتے۔ اس حرکت کو دیکھتے ہوئے مسجد کی انتظامیہ نے انھیں متفقہ طور پر کافر قرار دے دیا اور غریب سقے کی ملازمت دوبارہ بحال ہو گئی۔

اسی دوران کسی نے یہ کہہ دیا کہ خوش رہنے اور مسکرانے سے صحت اچھی رہتی ہے۔ اب تو وہ اپنے چہرے پر ہر وقت خوشی کی مصنوعی سی کیفیت اور ہونٹوں پر ایک ان جانی سی مسکراہٹ طاری کیے رکھتے۔ کسی کی موت کا تذکرہ کرتے، یا کہیں تعزیت وغیرہ کو جاتے تو بھی اندازِ بیان انتہائی خوش گوار ہوتا، جس کی وجہ سے لوگ سخت متنفر ہو گئے اور کامی کی دماغی صحت کے بارے میں ان کا شک یقین میں بدل گیا۔

پھر کہیں یہ سن لیا کہ سبزہ دیکھنا اور صبح کے وقت ٹھنڈی اوس پر چلنا نظر اور دماغ کے لیے بے حد مفید ہوتا ہے۔ کئی ماہ تک اوس پر چلتے رہے۔ جب امیدوں پر اوس پڑتی نظر آئی اور کوئی افاقہ نہ ہوا (جو، جوتے پہن کر چلنے سے ہو بھی کیسے سکتا تھا) تو انھوں نے اپنی تمام تر توجہ لڑکیوں کے بجائے سبزے پر مرکوز کر دی، البتہ اگر سبز کپڑوں میں بدصورت لڑکی بھی ہوتی تو اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ضرور دیکھتے۔ دودھ لینے جاتے تو بھینس کے سامنے پڑے ہوئے چارے کو گھورتے رہتے۔ راہ چلتے کوئی درخت نظر آ جاتا تو ٹکٹکی باندھے دیر تک اسے دیکھتے رہتے، خود آگے بڑھ جاتے تو مڑ مڑ کر اُس کا نظارہ کرتے۔ جب کبھی کھیتوں میں سے گزر ہوتا تو جانوروں کو چرتا دیکھ کر رشک کرتے، اور ورڈز ورتھ کو جسے وہ کبھی شاعر تسلیم ہی نہیں کرتے تھے (ہمیشہ چرواہا ہی کہتے تھے) اب فطرت کا بادشاہ ماننے لگے۔ اکثر انسانوں اور جانوروں کی صحت کا موازنہ کرتے اور اشرف المخلوقات کی خرابیِ صحت کا واحد سبب یہ بتاتے کہ وہ جن چیزوں سے کوسوں دور بھاگتا ہے، جانور انھی کو رغبت سے کھاتے ہیں، اسی لیے ان کی صحت برقرار رہتی ہے اور وہ بیمار نہیں پڑتے۔ مثال کے طور پر بھینسیں کھل شوق سے کھاتی ہیں، جس کی وجہ سے نہ صرف ان کے اپنے بچوں کے لیے ڈبے کا دودھ خریدنے کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ ہمارے بچوں کے لیے بھی وافر مقدار میں دودھ مہیا ہو جاتا ہے۔ اگر عورتیں ان بے زبانوں سے سبق سیکھیں (اور باقاعدگی سے کھل کھانا شروع کر دیں) تو وہ اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ آئندہ کوئی انسانی بچہ ماں کے دودھ سے محروم رہنے کی بنا پر مرحوم نہ ہوگا۔ نیز اس کے ساتھ ساتھ اگر عورتیں خود بھی بے زبان بن جائیں یعنی مردوں سے زبان چلانا چھوڑ دیں تو مرد بے چارے بھی طویل عمر پا جائیں (کامی کہتے ہیں اگر بیوی زبان دراز ہو تو پھر میاں کی عمر دراز نہیں ہوتی)۔

ایک روز پریکٹیکل سے فارغ ہو کر سائنس لیبارٹری سے نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کامی سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتے اور ڈگ بھرتے چلے آ رہے ہیں۔ ابھی ٹھیک سے سلام دعا بھی نہ کرنے پائے تھے کہ انھوں نے گلوکوز میں شامل عناصر کے نام دریافت کیے۔ ہم نے حیران ہو کر سگریٹ اور گلوکوز کا تعلق پوچھا تو کہنے لگے، ''کچھ کچھ ذہن میں ہے، فارمولا بتاؤ گے تو کوئی رشتہ قائم کر سکوں گا۔'' فارمولا (CHO) بتایا تو اچھل پڑے اور سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر دھواں ہمارے منہ پر پھینکتے ہوئے انکشاف کیا کہ سگریٹ نوشی

وافر مقدار میں گلوکوز حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے (بادہ نوشی ہے باد پیمائی!) اور تاویل اس کی یہ پیش کی کہ جلنے کا عمل آکسیجن کے بغیر نامکمل رہتا ہے، جو سب ہی جانتے ہیں، اور اس عمل کے دوران جو دھواں پیدا ہوتا ہے، وہ کاربن کی ایک شکل ہے، اس سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا، اب رہی ہائیڈروجن، تو سگریٹ پینے والا جب کش لے کر دھواں باہر خارج کرتا ہے تو اس میں بخارات شامل ہوجاتے ہیں اور بخارات پانی سے بنتے ہیں، جس کا ایک اہم جزو ہائیڈروجن ہے، یہ وہ بھی جانتے ہیں جنھوں نے کبھی سائنس نہیں پڑھی۔ پس ثابت ہوا کہ سگریٹ پینے سے گلوکوز میں شامل تینوں اجزا یعنی کاربن، ہائیڈروجن اور آکسیجن بہ آسانی حاصل ہوجاتے ہیں۔ ہم اس توجیہہ پر انگشت بہ دندان رہ گئے اور یوں ہی ان کے بڑھتے ہوئے وزن اور کھلتے ہوئے رنگ کی نشان دہی کی تو خوش ہو کر ہمیں بھی پابندی سے سگریٹ پینے کی تاکید کی۔

اس واقعے کے چند ہی روز بعد لائبریری سے نکل رہے تھے کہ کامی موٹر سائیکل پر منہ اور تھیلا لٹکائے نمودار ہوئے۔ ہم سمجھے شاید امتحان کا نتیجہ آ گیا ہے، مگر استفسار کرنے پر پتا چلا کہ انھوں نے پانچ ماہ سے کالج کی فیس جمع نہیں کرائی اور گھر سے رقم وصول کر کے اس سے گلوکوز پیتے رہے، اس لیے نام کٹ گیا ہے۔ تسلی دی اور فیس جمع کرا دینے کی پیش کش کی تو چہرے پر رونق پلٹ آئی۔ فوراً تھیلے میں سے مٹی میں لت پت ایک چقندر نکال کر ہماری طرف بڑھایا کہ یہ صاف خون پیدا کرے گا۔

جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو کامی نے ہماری صحت قدرے ٹھیک ہوتے دیکھ کر اپنے تمام معمولات و ماکولات ترک کر کے نہایت سنجیدگی سے ایک ساتھ ورزش کرنے کا پروگرام بنایا۔ ہم صبح سویرے پگ ڈنڈی پر دوڑتے ہوئے کچھ فاصلے پر واقع ایک گاؤں تک جایا کرتے تھے۔ انھوں نے بھی ہمارے ساتھ دوڑنا شروع کیا، مگر دوڑ لگانے کے لیے پگ ڈنڈی کا راستہ چھوڑ کر قریب سے گزرتی ہوئی ریلوے لائن کا انتخاب کیا (کیوں کہ بقول ان کے، انسان کو زمانہ طالب علمی میں ہی اپنے لیے کوئی نہ کوئی لائن منتخب کر لینی چاہیے) ۔ دو دن تو خیریت سے گزر گئے۔ تیسرے روز پتا نہیں اچانک انھیں کیا سوجھی کہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دوڑنے کے بجائے دونوں پٹریوں کے بیچوں بیچ دوڑنا شروع کر دیا۔ دور سے ریل کی سیٹی سنائی دی تو پریشانی کے عالم میں رفتار اور تیز کر دی کہ کہیں ایسا نہ ہو گاڑی کے نیچے آ جائیں۔ اتفاق سے پھاٹک پر موجود سگنل مین نے دیکھ لیا اور فوراً لال جھنڈی لہرا کر گاڑی رکوائی۔ مسافر ایک ایک کر کے نیچے اترنا شروع ہوئے تو کامی گھبرا سے گئے۔ لوگوں کو بہت سمجھایا کہ وہ جان دینے نہیں، بنانے جا رہے تھے، اور یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی نہیں، ان کی اپنی ہے مگر مسافر پھر بھی انھیں لنگوٹ کس کر مرنے کے بجائے، کمر کس کر مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ہی تلقین کرتے رہے کہ اتنے میں گارڈ نے ہری جھنڈی دکھا دی۔

اسلام آباد 1972ء

گمشتی مزار.....بے بس زائرین

(ایک خواب)

در و دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن، ہم تو سفر کرتے ہیں

1974ء میں پہلی بار کراچی آنا ہوا تو میزبان سے صدر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے مصروفیت کے باعث معذرت چاہی، اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ کچھ دیر بعد انھی کے ہاں واپس آجائیں گے، ہمیں بس اسٹاپ تک چھوڑنے آئے، ورنہ کراچی میں اس وقت بھی کسی کے پاس مہمانوں کے لیے وقت نہ تھا، بلکہ بقول شخصے مرنے کی بھی فرصت نہ تھی (سنتے ہیں کہ اس مسئلے کا حل تلاش کرلیا گیا ہے، اور اب مرنے کے لیے فرصت نکالنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، صرف گھر سے نکلنا ہی کافی ہے)۔ بہ ہر حال اسٹاپ پر کھڑے کھڑے کافی دیر ہوگئی تو ہم نے سوالیہ نظروں سے اپنے میزبان کی طرف دیکھا۔ اشارہ بھانپتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ صدر کی طرف جانے والی اکثر بسیں لالوکھیت سے ہوکر گزرتی ہیں، اس لیے وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے یک لخت فضا میں ایک شور سا بلند ہوا۔ وہاں سے بھاگنے ہی والے تھے کہ بڑے میاں نے لپک کر ہمارا بازو تھام لیا اور تسلی دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، یہ بس کی آواز ہے۔ جھینپ مٹاتے ہوئے ہوائی حملے کا بہانہ کیا تو انھوں نے یہ کہہ کر اور بھی شرمندہ کردیا کہ وہ تو بوڑھے ہوکر اپنی اہلیہ سے نہیں ڈرتے اور ہم جوان ہوتے ہوئے محض ایک جنگی طیارے کے خیال سے خوف زدہ ہوگئے۔ آواز سے تیز رفتار جہازوں کا ذکر تو بچپن سے سنتے آئے تھے، رفتار سے زیادہ آواز دینے والی بس کا مشاہدہ زندگی میں پہلی بار ہوا۔ رہا ان کا اپنی اہلیہ سے نہ ڈرنے کا سوال تو وہ حرف بہ حرف صحیح تھا، کیوں کہ بے چاری دونوں ہاتھ پاؤں سے معذور تھیں۔

آواز لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی گئی اور کچھ دیر بعد ایک پیچیدہ قسم کی قوی ہیکل مشینری سامنے آکھڑی ہوئی۔ ہمیں سائنس کی اس عجیب وغریب قدیم ایجاد کو اندر سے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور اس پر سوار ہوگئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ چھت سے ذرا نیچے دونوں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر طاق بنے ہوئے ہیں اور ان میں دیے سے جل رہے ہیں۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ہم نے اپنے سر پر رومال رکھا اور... ابھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے ہی والے تھے کہ ایک صاحب نے للکارتے ہوئے وضاحت کی کہ عبداللہ شاہ غازی کا مزار کلفٹن میں

ہے، جہاں صدر سے 20 نمبر بس جاتی ہے۔ پھر انھوں نے مزید رہنمائی کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ یہ کوئی گشتی مزار نہیں، بس ہے اور جنھیں ہم چراغ سمجھ رہے ہیں، وہ بتیاں ہیں۔ یہ سنتے ہی حواس باختہ سے ہو کر نیچے اتر گئے، مگر جب نظر مشینری کے آگے لگے ہوئے تختہ سیاہ پر پڑی تو ان صاحب کا قائل ہونا پڑا، کیوں کہ ہماری مطلوبہ بس یہی تھی۔

چھت پر ایک بڑا سا ڈرم رکھا ہوا تھا۔ ہم نے ایک شخص سے، جو لوہے کی ایک لمبی سی سلاخ لیے بس کے سامنے کھڑا تھا، اس کے بارے میں دریافت کیا:

''یہ ڈرم یہاں پر کیوں رکھا ہوا ہے؟''

''یہ دراصل پانی کی ٹنکی ہے۔ اس سے ایک پائپ انجن میں جا رہا ہے۔ جب انجن گرم ہو جاتا ہے تو ڈرائیور فوراً قریب لگی ہوئی ٹونٹی کھول دیتا ہے۔''

''ڈرائیور صرف ٹونٹی ہی کھولتا اور بند کرتا ہے، یا گاڑی بھی چلاتا ہے؟''

''دونوں کام کرتا ہے۔''

''بڑا پھرتیلا آدمی معلوم ہوتا ہے۔''

''جی ہاں، گاڑی روک کر جلدی سے ٹونٹی کھولتا ہے اور انجن کا پانی تبدیل کرتے ہی دوبارہ گاڑی چلا دیتا ہے۔''

''اس عمل میں کتنا وقت لگ جاتا ہوگا؟''

''بس جی، یہی کوئی بیس پچیس منٹ!''

''پھر تو واقعی بڑا پھرتیلا آدمی ہے۔''

''عزت افزائی کا بہت بہت شکریہ، وہ بندۂ ناچیز میں ہی ہوں۔''

جھٹ پٹ بس میں بیٹھ گئے۔ آنکھیں موند لیں، کانوں پر ہاتھ رکھ لیے، اور اپنے صدر پہنچنے کا انتظار کرنے لگے۔ اس قدر ہچکولے لگے کہ کھایا پیا سب ہضم ہو گیا۔ سوچنے لگے، اس سے تو اپنا راول پنڈی ہی اچھا ہے۔ صوبائی دارالحکومت نہ سہی، کم از کم سڑکیں تو اچھی ہیں۔ گڑھے بڑے بڑے ہیں، جن میں ٹریفک بغیر کسی رکاوٹ کے بہ آسانی چل سکتی ہے اور اتنا عرصہ آدمی آرام سے تو بیٹھ سکتا ہے، جب تک کہ سڑک کا پکا ٹکڑا شروع نہ ہو جائے۔ انھی خیالوں میں گم تھے کہ اچانک ایک زوردار دھکے سے آنکھ کھل گئی۔ خوش ہوئے کہ سفر کٹ گیا، مگر کھڑکی سے باہر جھانکا تو پتا چلا کہ طیارہ ابھی تک رن وے پر ہی تھا، اور ڈرائیور باہر کھڑا انجن کو چلنے پر آمادہ کر رہا تھا، اور یہ زبردست جھٹکا انجن کی آمادگی کے اظہار کی تمہید تھی۔ دل ہی دل میں سخت شرمندہ ہوئے کہ خواہ مخواہ کراچی کی سڑکوں کی مدح میں اتنا بڑا قصیدہ کہہ ڈالا۔ پھر اچانک باہر نظر پڑی تو دیکھا درخت اور آبادی مخالف سمت میں حرکت کر رہے ہیں، جس سے اپنے آگے بڑھنے کا احساس ہوا۔

ونڈ اسکرین کی جگہ پر شیشے یا پلاسٹک کے بجائے ایک گتہ لگا ہوا تھا، جس میں ایک بڑا سا گول سوراخ تھا، جو ڈرائیور کی سیٹ سے کافی بلندی پر واقع بس کے کسی مرحوم ڈرائیور کے طویل القامت ہونے کی غمازی کر رہا تھا، اس لیے ڈرائیور بار بار اچک اچک کر سامنے سے سڑک کا جائزہ لے رہا تھا۔ ڈرائیور کے برابر ایک اور شخص بھی اگلی نشست پر دائیں طرف کی کھڑکی سے اپنی گردن نکالے بیٹھا ہوا تھا۔ کنڈیکٹر کو اشارہ کرتے ہوئے، اس کے یوں منہ لٹکائے بیٹھنے کی وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ گاڑی لیفٹ ہینڈ ڈرائیو ہے اور وہ ان کا ساتھی ہے، جو اوورٹیک کرتے وقت ڈرائیور کی رہنمائی کرتا ہے (اور اگر ناراض ہو جائے تو چلتی بس سے چھلانگ لگا کر حادثہ بھی کرا سکتا ہے)۔ اور نہ صرف یہ کہ اس نامعقول کو اپنے کام کا معقول معاوضہ ملتا ہے، بلکہ پورا عملہ اسے راضی (اور خود کو زندہ) رکھنے کے لیے ڈرائیور کی اجازت سے اسی کو استاد کہتا ہے۔

ابھی چلے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک لڑکا ہاتھ میں ربڑ کا پائپ تھامے ہماری طرف بڑھا،

''کھڑے ہو جائیں، ڈیزل ڈالنا ہے۔''

''ہم ڈیزل سے نہیں چلتے۔''

''جی ٹنکی آپ کی سیٹ کے نیچے ہے۔''

''کیا چلتی ہوئی گاڑی میں ڈیزل ڈالو گے؟''

''جی نہیں، گاڑی پیٹرول پمپ پر کھڑی ہوئی ہے۔''

باہر نظر دوڑائی تو دیکھا درخت اور عمارتیں اپنی اپنی جگہوں پر قائم ہیں، جس سے بس کے رکے رہنے کی تصدیق ہوئی، اور ہم ڈیزل بھروانے کے لیے اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈیزل کی بو سونگھتے ہی انجن بے ہوش ہو گیا اور مسافروں سے دھکا لگانے کی دردمندانہ اپیل کی گئی، یوں بس دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہوئی۔ اسی دوران لوگوں کی زبانی پتا چلا کہ یہ ان کا روزانہ کا معمول ہے، کیوں کہ شہر میں چلنے والی بسیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب اس حال کو پہنچ گئی ہیں کہ رات بھر مکینک لائٹیں جلائے ان کے نیچے لیٹتے ہیں، تب کہیں جا کر صبح کو مسافر ان کے اوپر بیٹھتے ہیں۔ نیز اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لیے مسافر، کنڈیکٹر کو کرایہ دینے کے ساتھ ساتھ بس کو دھکا بھی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بسوں کے کرائے ملک کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں قدرے کم ہیں۔ اس موقعے پر اپنے دوست عرفی کی تحقیق (جو اُس وقت بی اے میں تاریخ کے طالبِ علم تھے) بالکل صحیح معلوم ہوئی کہ کراچی میں چلنے والی بسوں کا تعلق ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے ہے اور انگریزوں نے انھی بسوں پر سوار ہو کر پہلی بار سرزمینِ ہند پر قدم رکھا تھا اور واپسی پر ملک کے ساتھ ساتھ بے بسی کے عالم میں اپنی بسیں بھی یہیں چھوڑ گئے۔

کچھ ہی دیر بعد دھواں نمودار ہونا شروع ہو گیا۔ ہم نے متفکر ہو کر کہ ''یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے'' کنڈیکٹر کو خبردار کیا تو اس نے ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے اس راز سے آگاہ کیا کہ انھوں نے دھویں کے اخراج کا انتظام بس کے اندر ہی کر رکھا ہے۔ اس

طرح ایک تو سائیلنسر کا خرچ بچتا ہے اور دوسرے دھواں چھوڑنے والی گاڑیوں کا جب چالان کیا جاتا ہے تو وہ اس سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند لمحوں میں برکھارت کی سیاہ گھٹائیں چھا گئیں۔ اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے معصوم بچے اس صورتِ حال سے سخت پریشان ہو گئے۔ ایک بچے کو نیند نے تنگ کرنا شروع کیا، تو دوسرے کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ وہ ابھی تو ناشتا کر کے گھر سے نکلا تھا، ابھی سے رات کیسے ہو گئی۔ اسی اثنا میں ڈرائیور نے بس کی رفتار کچھ تیز کی تو بادل کی ایک زوردار گرج سے سیٹیں بھی آنکھیں ملتی ہوئی بیدار ہو گئیں اور مستی کے عالم میں جھک جھک کر ایک دوسرے کا منہ چومنے لگیں:

گلوں کا لب نہر پر جھومنا
اسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر
نشے کا سا عالم گلستان پر

یہ رومان پرور منظر ہم سے برداشت نہ ہوا اور ایک جھٹکے سے نیچے آ رہے۔ کنڈیکٹر دوڑتا ہوا آیا اور حفاظتی بند نہ باندھنے پر تعجب کا اظہار کیا۔ ذہن پر زور ڈالنے لگے کہ بس اسٹاپ سے کس چیز پر سوار ہوئے تھے کہ اچانک ہماری نظر سامنے بیٹھے ہوئے ایک دھندلے سے سائے پر پڑی، جو اپنے سامان سمیت سیٹ سے بندھا بیٹھا تھا۔ ناچار ہم نے بھی قریب لٹکی ہوئی رسی کی ''پیٹی'' باندھ لی اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایسا لگا جیسے کسی نے ریڈیو کھول دیا ہے اور وہاں سے مقامی خبریں نشر کی جا رہی ہیں۔ چناں چہ شہر کی تازہ ترین صورتِ حال جاننے کی غرض سے اپنے کان اس طرف لگا دیے:

''آج کراچی میں ٹرانسپورٹرز نے اپنی بسوں کی صد سالہ تقریبات زور شور سے منائیں۔ زور کنڈیکٹروں کا اور شور بسوں کا تھا، جو چیخ چیخ کر اپنے اوپر سو سال سے ہونے والے مسلسل ظلم کے خلاف فریاد کر رہی تھیں۔ تقریبات کا آغاز قرآن خوانی سے ہوا، جو موجودہ بس مالکان کی جانب سے گم نام خریداروں کی 65 ویں برسی کے سلسلے میں مرحومین کے ایصالِ ثواب کے لیے کرائی گئی تھی۔ اس موقعے پر کئی دل سوز مناظر بھی دیکھنے میں آئے۔ بعد ازاں بس مالکان نے ان بسوں کی خالق، مرحوم کمپنیوں کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا اور بھاری اکثریت سے ایک قرارداد منظور کی۔ اس قرارداد کی رُو سے انھوں نے اپنے اس عزم کا اعادہ کیا ہے کہ اگر انتظامیہ کی بے حسی اور عوام کا دھکا اسی طرح شاملِ حال رہا تو وہ مزید سو سال تک یہی بسیں چلا کر ان کمپنیوں کا نام روشن کرتے رہیں گے!''

اچانک ایک زوردار جھٹکے سے آنکھیں کھولیں تو دیکھا بس صدر میں کھڑی محوِ رقص ہے۔ غالباً ڈرائیور اب انجن کو ذرا دم لینے پر اکسا رہا تھا۔ رسی کھولی، نیچے اترے اور بازار کا رخ کیا۔ یہاں سے بس اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ ہوئی تو اسے چلتا ہوا دیکھ کر کنہیا لال کپور یاد آ گئے، جنھوں نے اپنے ایک مضمون میں اُردو کی آزاد نظموں کا خاکہ اُڑاتے ہوئے انتہائی آزادی سے ریل گاڑی کچھ اس طرز پر چلائی تھی:

کھڑڑ کھڑڑ کھڑ
کھڑ کھڑ کرتی
گھڑڑ گھڑڑ گھڑ
گھڑ گھڑ کرتی
بھڑڑ بھڑڑ بھڑ
بھڑ بھڑ کرتی
چلی جا رہی ہے
اِک گاڑی

اسلام آباد 1974ء

دجّال (شیطان کا بیٹا)

انگریزی ادب سے درآمد ایک خوفناک ناول۔ علیم الحق حقی کا شاندار اندازِ بیاں۔ شیطان کے پجاریوں اور پیروکاروں کا نجات دہندہ شیطان کا بیٹا۔ جسے بائبل اور قدیم صحیفوں میں بیسٹ (جانور) کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ انسانوں کی دُنیا میں پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارے درمیان پرورش پا رہا ہے۔ شیطانی طاقتیں قدم قدم پہ اسکی حفاظت کر رہی ہیں۔ اسے دُنیا کا طاقتور ترین شخص بنانے کے لیے مکروہ سازشوں کا جال بنا جا رہا ہے۔ معصوم بے گناہ انسان، دانستہ یا نادانستہ جو بھی شیطان کے بیٹے کی راہ میں آتا ہے، اسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

دجّال...... یہودیوں کی آنکھ کا تارہ جسے عیسائیوں اور مسلمانوں کو تباہ و برباد اور نیست و نابود کرنے کا مشن سونپا جائے گا۔ یہودی کس طرح اس دُنیا کا ماحول دجال کی آمد کے لیے سازگار بنا رہے ہیں؟ دجالیت کی کس طرح تبلیغ اور اشاعت کا کام ہو رہا ہے؟ دجال کس طرح اس دُنیا کے تمام انسانون پر حکمرانی کرے گا؟ 666 کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب آپ کو یہ ناول پڑھ کے ہی ملیں گے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ اس ناول کو شروع کرنے کے بعد ختم کر کے ہی دم لیں گے۔ دجال کا پہلا اور دوسرا حصہ کتاب گھر پر دستیاب ہیں۔

ناکامیوں کا نچوڑ

''آج تو غضب ہو گیا، میں اخبار لایا تھا۔''

''حسبِ عادت کسی سے مانگ کر ہی لائے ہو گے۔''

''جی نہیں، پورے پچیس پیسے خرچ کیے ہیں۔''

''پھر تو واقعی غضب ہو گیا۔''

''کچھ پتا بھی ہے، چار اور پانچ ستمبر 1972ء کی درمیانی شب کو انٹر کا نتیجہ آ رہا ہے۔''

''نتیجہ اور ابھی سے، یہ تم خلافِ معمول بہکی بہکی سی باتیں کیوں کر رہے ہو۔''

''یہ باتیں خلافِ معمول نہیں، حسبِ معمول ہیں، یہ لو اخبار اور خود پڑھ لو۔''

چائے میں ڈوبی ہوئی نتیجہ خیز خبر پڑھتے ہی ہم چونک پڑے:

''کامی یہ اخبار تو مجھے کسی ہوٹل کا معلوم ہوتا ہے؟''

''ہاں یار، ابھی ایک ریستوران میں گیا تھا، بیرے نے ناشتا لانے میں دیر کر دی تو میں یہ اخبار اٹھا کر تمھارے پاس چلا آیا۔ مجھے غصہ نہ آتا تو تمھیں یہ خبر بھی معلوم نہ ہوتی، سمجھے۔''

''مگر ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ پورے پچیس پیسے خرچ کیے ہیں۔''

''بس یار، اب شرمندہ کرنے کی بجائے ناشتا کرنے کی فکر کرو اور مجھے بھی کراؤ۔''

کامی کے جاتے ہی ہم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کسی نہ کسی طرح قرآن پاک کا بالائے طاق رکھا ہوا نسخہ اتار ڈالا اور اس پر پڑی ہوئی مٹی کی تہہ کو صاف کیا۔ دیکھنے والوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ کسی نے جھوٹا حلف اٹھانے سے منع کیا اور معاملے کو مذاکرات کے ذریعے سلجھانے کی ہدایت کی۔ کسی نے چھپ کر شادی کرنے پر لعنت ملامت کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ اب شرمانے کی ضرورت نہیں، گھر والوں کو صاف صاف بتا دو تا کہ لڑکی کو اکیلے لانے کے بجائے باعزت طریقے سے قرآن اور ماں کے سائے تلے رخصت کرایا جا سکے، مگر جب باقاعدہ تلاوت شروع کی تو سب سمجھ گئے کہ کوئی اس سے بھی زیادہ سنگین مسئلہ درپیش ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کامیابی کے حصول کے لیے چند خاص وظائف کا ورد اپنے معمولات میں شامل کیا، بزرگوں سے دعا کرنے کی اپیل کی، پابندی سے مسجد جانے لگے اور تمام برے کاموں سے وقتی طور پر توبہ کر لی۔ کیوں کہ بقول کامی نتیجے کی تاریخ معلوم ہو جانے کے بعد طالب علموں کو

بھی وہی کچھ کرنا چاہیے جو عام طور پر پھانسی کی تاریخ ملنے پر جیل میں قیدی حضرات کیا کرتے ہیں، بصورتِ دیگر نتیجہ خراب ہو سکتا ہے۔

پانچ تاریخ آئی۔ دونوں نے باجماعت فجر کی نماز ادا کی۔ بازو پر امام ضامن باندھا اور خالی پیٹ وظیفہ پڑھتے ہوئے گھر سے نکل پڑے (کامی کا کہنا تھا کہ اگر نتیجہ معلوم کرنے سے پہلے راستے میں وظیفہ پڑھا جائے تو امتحان میں بھی وظیفہ ملتا ہے)۔ ابھی اُردو بازار میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک نجومی پر نظر پڑی، جو طوطا لیے بیٹھا تھا۔ کامی ہمارا ہاتھ تھام کر اُس طرف ہو لیے:

''کیوں نہ ایک روپے میں گزٹ دیکھنے کے بجائے پہلے دس پیسے میں طوطے سے فال نکلوا لی جائے!''

''کامی کچھ بھی ہو، طوطا ہمیں نمبر اور ڈویژن نہیں بتائے گا، یہ سب دھوکا ہے۔''

''تمھیں تو ہر چیز میں فریب نظر آتا ہے، معصوم طوطے کی نیت پر بھی شبہ کرنے سے باز نہیں آتے، پرندے کی فال کو بھی ریفری کا فاؤل سمجھ رہے ہو۔ طوطا، طوطا چشم ضرور ہے، مگر پھر بھی جانور ہے، انسان نہیں کہ اس پر اعتبار نہ کیا جا سکے، میں تو یہ فال ضرور نکلواؤں گا۔''

بہر کیف کامی نے دس دس پیسے کے دو سکے پھینکے۔ طوطے نے اپنی چونچ سے ایک ایک لفافہ اٹھا کر دونوں کی طرف بڑھایا اور آنکھیں پھیر لیں (اپنی جگہ پر جا کھڑا ہوا)۔ دونوں نے اپنا اپنا لفافہ اٹھا کر اُس میں رکھا ہوا کارڈ نکالا اور جلدی جلدی پڑھنا شروع کیا۔ کامی تو خوشی سے پاگل ہو گئے اور ہم نے اپنا سر پیٹ لیا، لیکن پہلے کامی کی قسمت کا حال:

''ماضی کے اچھے کام کی آج قدر کی جائے گی۔ توقع سے زیادہ کامیابی حاصل ہوگی۔ نتیجہ اچھا نکلے گا۔ آپ کی صلاحیتوں کی نمائش ہو سکتی ہے۔ شہرت اور مقبولیت میں اضافہ ہوگا۔ خوشیاں منانے کی تیاریاں کریں۔ آپ کی قسمت کا ستارہ بہت بلند ہے۔ آپ کو تحفے بھی ملنے والے ہیں۔''

اور اب ہماری تقدیر کا حال، جس نے ہمیں بے حال کر دیا، ملاحظہ ہو:

''تندہی سے کام کریں، جائیداد کا مقدمہ آپ جیت لیں گے۔ آمدنی میں اضافہ ہوگا، محبت میں ناچاقی دور ہو جائے گی، ایک بار اتر جائے گا۔ کسی تقریب کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ گھر کی فالتو چیزیں فروخت کر کے رقم حاصل کر لیں۔ آج کا دن خریداری کے لیے بہت مناسب ہے، مگر کسی جگہ پر زیادہ نہ ٹھہریں۔''

یہ پڑھتے ہی ہم وہاں سے کھسک لیے۔

کامی کو یقین تھا کہ طوطے کی نکالی ہوئی فال کے مطابق آج سے ان کا طوطی بولے گا، مگر وہاں سے آگے بڑھے تو دیکھا ایک دکان کے سامنے بہت سے نوجوان گم چند ایک بم کھڑے ہیں اور بہت سے بین کر رہے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو کامی نے اُدھر سے آنے والی ایک لڑکی کو مخاطب کیا:

''جی یہ صبح صبح کس کا انتقال ہو گیا ہے؟''

''یہ جنازہ نہیں ہے، رزلٹ آؤٹ ہوا ہے۔''

''مگر لڑکے کیوں آؤٹ ہو رہے ہیں؟''

''خود جا کر دیکھ لیں!''

ان کے ترش لہجے سے اندازہ ہوا کہ موصوفہ اپنا نتیجہ معلوم کر چکی تھیں۔

''کمال ہے، اب پرچوں کے ساتھ ساتھ رزلٹ بھی آؤٹ ہونے لگا ہے۔'' کامی زیرِ لب بڑبڑائے۔

اب تو ہم پر نتیجہ طاری ہو گیا۔ کچھ دیر تو بے حس و حرکت کھڑے رہے، مگر پھر آگے بڑھے کہ دو چار قدم تو دشمن بھی تکلیف گوارا کرتے ہیں۔ دیکھا ایک شخص درمیان میں بیٹھا طلبہ کے رول نمبر لکھ رہا ہے اور دوسرا میز پر کھڑا انھیں رلا رہا ہے۔ باری آنے پر ہم نے بھی ڈرتے ڈرتے ایک روپیہ دیا، لڑکھڑاتی زبان سے اپنا رول نمبر بتایا اور بے چینی سے نتیجے کا انتظار کرنے لگے۔ یکایک میز پر کھڑا ہوا آدمی گردن کی رگیں پھیلاتے ہوئے بولا:

''مبارک ہو، اب تک بتائے گئے نتائج کی روشنی میں آپ پہلے واحد شخص ہیں جو صرف ایک مضمون (کیمسٹری) میں فیل ہوئے ہیں، ورنہ یہاں تو مضامین کی قطاریں لگی پڑی ہیں۔''

یہ سنتے ہی دل پژمردہ سا ہو گیا، مستقبل تاریک اور لوگ باریک دکھائی دینے لگے، پری میڈیکل پیرا میڈیکل میں تبدیل ہوتا نظر آنے لگا، اسپتال ویران اور مریض پریشان سے لگنے لگے۔ گرتے پڑتے ہجوم سے باہر نکلے تو کامی پر نظر پڑی اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ صرف ایک مضمون (انگریزی) میں فیل ہونے والے دوسرے ''واحد'' شخص ہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو تسلی دی اور اپنے ایک جیسے انجام پر کسی قدر اطمینان کا سانس لیا۔

وہاں سے واپس پلٹنے تک ہمارے ہاتھوں کے طوطے تو اڑ چکے تھے، مگر نجومی کا طوطا وہیں بیٹھا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی کامی نے طوطوں کی برائی میں جتنے بھی محاورے انھیں یاد آئے (جن میں اپنے منہ میاں مٹھو بننا، طوطا چشم ہونا، طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لینا، طوطے کی سی ناک ہونا سرِ فہرست تھے) نہ صرف اسے دور سے سنا ڈالے، بلکہ ان محاورات کی صداقت پر اپنی مہرِ تصدیق بھی ثبت کر دی۔

اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے دونوں ایک ریستوران میں پہنچے۔ وہاں سب سے پہلے کامی نے اپنے دادا (جو ابھی تک زندہ ہیں) کے دیے ہوئے تعویذ کامیابی اتارے اور بیرے کو آواز دی۔ دونوں نے خوب سیر ہو کر ناشتا کیا، پھر اپنا اپنا امام ضامن کھول کر ہوٹل کا بل ادا کیا اور گھر کی راہ لی۔ راستے میں کامی نے اس یقین کا اظہار کیا کہ دادا حضور نے والد مرحوم کی کسی غلطی کا بدلہ ان سے لیا ہے اور جان بوجھ کر انھیں ایسے تعویذ دیے کہ وہ فیل ہو گئے۔ وہیں والد صاحب کے ایک پرانے دوست ٹکرا گئے جنھوں نے محنت نہ کرنے پر بہت برا بھلا کہا۔ اسی روز ان کی زبانی یہ راز بھی منکشف ہوا کہ ہمارے والد ایک غریب آدمی ہیں اور وہ ہمارا پیٹ کاٹ کر ہمیں تعلیم دلا رہے ہیں، ورنہ ہم تو خود کو اب تک رئیس زادہ ہی سمجھ رہے تھے۔

گھر کے قریب پہنچے تو امام صاحب، جن کے پیچھے صبح نماز پڑھی تھی، مل گئے اور بڑی شفقت سے نتیجہ دریافت فرمایا۔ سوچا بے

چاروں کو ہمارا کتنا خیال ہے، اس لیے ان سے سچ بولنا صریحاً ظلم ہوگا (اور جھوٹ بولنا شرعاً گناہ) چناں چہ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ نتیجہ فی الحال روک لیا گیا ہے۔ اب جمعہ کے روز مسجد میں جب بھی ان سے نظر ملتی وہی جواب دے دیتے اور وہ مایوس ہو کر خطبہ شروع کر دیتے۔ ہم سے ان کی یہ مسلسل مایوسی نہ دیکھی گئی اور آخر کار اس مسجد میں جمعہ پڑھنا ہی ترک کر دیا۔

گھر میں داخل ہوئے تو نتیجہ صورت سے ہی عیاں تھا، اس لیے کسی نے پوچھ کر خواہ مخواہ شرمندہ ہونا مناسب نہ سمجھا۔ ہمیں دیکھتے ہی انقلابی اشعار، ضرب الامثال اور اقوالِ زرّیں کی مدد سے ہمت بندھائی گئی۔ کسی نے بادشاہ اور مکڑی کا قصہ سنا کر حوصلہ بڑھایا، کسی نے یہ شعر سنا کر شہسواروں کے میدانِ جنگ میں گرنے کو ان کی بہادری سے تعبیر کیا:

گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں
وہ طفل کیا گرے جو گھٹنوں کے بل چلے

کسی نے بتایا کہ زندگی ایک مسلسل امتحان ہے اور دنیا ایک امتحان گاہ ہے (اس لیے انسان کو مسلسل امتحان ہی دیتے رہنا چاہیے!) کسی نے موقع محل کی نزاکت کو سمجھے بغیر کچھوے اور خرگوش کی فرسودہ سی کہانی سنائی۔ غرض شکست اور ناکامی کی اہمیت پر نہ صرف پُر اثر انداز میں روشنی ڈالی گئی، بلکہ سچ مچ یہ ثابت کر کے دکھایا گیا کہ جو ناکام نہ ہو وہ کبھی کوئی کام نہیں کر سکتا اور نہ زندگی میں کوئی بلند مقام پا سکتا ہے۔ ناکامی دراصل کامیابیوں کا پیش خیمہ ہے اور یہ ناکامی ہمارے لیے آئندہ زندگی میں کامیابیوں کے حصول کے لیے ناگزیر تھی اور اس کے بغیر ہم ترقی کے زینے پر قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ پاس نہیں ہوئے، اچھے نمبر لے کر امتحان پاس کرنے والوں کی حالت پر رونا آ گیا کہ وہ بے چارے اب زندگی بھر کوئی بلند مقام حاصل نہ کر سکیں گے! مگر جب ترقی کا زینہ چڑھتے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچے تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی۔ ابھی ٹھیک سے بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ پر تکلف ناشتا آ گیا، جسے کامی نے فیل ہونے کا پہلا ثمر قرار دیا۔ کامی نے ناشتا کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی دی ہوئی مثالوں کا عقلی تجزیہ شروع کیا تو انھیں مکڑی کا ذکر اس لیے سخت ناگوار گزرا کہ اگر ہم لوگوں نے سال میں دو بار امتحان دے کر اتنے راؤنڈ پورے کر بھی لیے جتنے کہ مکڑی نے محض دیوار پر چڑھنے میں ضائع کیے تھے تو عمر عزیز اسی کام میں تمام ہو جائے گی۔ نیز طفل جو گھٹنوں کے بل چلتا ہو اس کا گرنا تو سمجھ میں آتا ہے اور عین فطرت ہے مگر شہسواروں کا میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے اپنے گھوڑوں پر سے گر جانا انھیں ہرگز گوارا نہ تھا۔ بقول ان کے یا تو گرنے والے گھڑ سوار نہیں تھے سائیکل سوار تھے جنھیں شاعر نے زبردستی گھوڑوں پر بٹھا دیا اور وہ بہادری سے لڑتے ہوئے نہیں بے خیالی میں پیڈل گھماتے ہوئے زین سمیت گھوڑوں سے نیچے آ رہے یا پھر ہو سکتا ہے کہ ایسے ناتجربہ کار سواروں کو اپنی پشت پر پا کر گھوڑے خود ہی گرا گئے ہوں۔ رہی کچھوے اور خرگوش کی کہانی تو اس پر انھوں نے فوری طور پر کوئی تبصرہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور کہانی کے مطابق خرگوش تو دوڑ شروع ہونے کے بعد راستے میں سویا تھا وہ ناشتے میں ہی سو گئے۔

سو کر اٹھے تو انھیں اس زندگی سے (جس میں مسلسل ایف ایس سی کا امتحان ہو) موت بہتر لگی۔ مگر پھر خیال آیا کہ بے گناہ

والدین، ہم درد بہن بھائیوں اور اس لڑکی کا کیا بنے گا جو اُن سے محبت کرتی ہے، وہ اُن کے بعد کس سے شادی کرے گی، کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا اُن کے بعد؟ نیز بینک میں جو تین روپے اناسی پیسے جمع ہیں وہ کوئی اور لے لے گا۔

یہ خیال آتے ہی انھوں نے مرنے کے بجائے پڑھنے کا پروگرام بنایا، مگر اس تجویز پر عمل درآمد شروع کرنے سے پہلے ان کا مشورہ تھا کہ چل کر اپنی گناہ گار آنکھوں سے بھی گزٹ دیکھ لینا چاہیے، مبادا دُکان دار نے عجلت میں غلط رول نمبر دیکھ لیے ہوں، یا پھر ہوسکتا ہے اس گزٹ میں ہم فیل ہوں (کامی اس قدر شکی مزاج واقع ہوئے ہیں کہ اپنی دستاویز کی فوٹو کاپی کرانے کے بعد جب تک اسے اصل سے نہ ملالیں، دُکان دار کو ادائیگی نہیں کرتے۔ کئی بار تو وہ ٹائپ شدہ کاربن کاپی کو بھی اصل کاپی سے ملا کر دستخط کرتے ہوئے پائے گئے ہیں)۔ ہمیں زبردستی گھسیٹ کر ایک دوسری دکان پر لے گئے۔ وہاں بھی نتیجہ وہی رہا تو ندامت چھپاتے ہوئے بولے:

''چلو اب ذرا اپنے باقی دوستوں کی خیریت بھی دریافت کرلیں، جب تک ان کی نمایاں ناکامی کا علم نہ ہو جائے دل کو تشویش رہے گی''۔

دستک دی تو عرفی کے ہاں سے طبعیات، مان کے گھر سے بیالوجی اور میر کے دروازے سے اردو ہمارے غم میں برابر کی شریک ہوگئیں۔ اب تو ہمارے چہرے خوشی سے تمتما اٹھے اور سب اپنا اپنا غم بھول کر ایک دوسرے پر ہنستے ہوئے ایک قریبی ریستوران میں جمع ہوئے۔ امتحان میں کمپارٹ لینے والے ساتھیوں کی تعداد کو ملحوظ رکھتے ہوئے کامی نے خیال ظاہر کیا کہ ریل میں پورا ایک کمپارٹمنٹ بک کرایا جاسکتا ہے اور کسی پرفضا مقام کی سیر کی جاسکتی ہے (مگر بعد میں پتا چلا کہ ریلوے انتظامیہ کی نظر اب تک کسی ایسے مقام پر نہیں پڑی، اس لیے ریل کا گزر سوائے سانگلا ہل کے اور کسی ہل اسٹیشن سے نہیں ہوتا)۔ کامی اس بات پر خوش تھے کہ کمپارٹ لینے والوں میں سب سے زیادہ نمبر اُن کے ہیں اور انگریزی وفا کرتی تو وہ پورے ساڑھے تینتیس فی صد نمبر لے کر فرسٹ کلاس تھرڈ ڈویژن حاصل کرتے! (پہلے کامی کا خیال تھا کہ ڈاکٹر بننے کے بعد ایف آر سی ایس کرنے لندن جائیں گے تو کسی انگریز نرس سے نکاح کر کے وہیں سکونت اختیار کرلیں گے مگر انگریزی میں فیل ہونے کے بعد سے وہ انگریز عورتوں کے بھی سخت خلاف ہوگئے ہیں کہ جس قوم کی زبان نے وفا نہ کی اس کی عورتیں خاک وفا کریں گی!) واپسی پر اپنے ایک اور ہم جماعت کے ہاں قناتیں لگی دیکھ کر دل بیٹھ سا گیا۔ اندر داخل ہوئے تو یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ وہ کامی سے صرف 1/2 فی صد کم نمبر لے کر سپلیمنٹری کی زد میں آنے اور میڈیکل کالج جانے سے بال بال بچ گئے ہیں۔

اب ہم لوگوں نے دوبارہ ایک ایک مضمون کے امتحان دینے کا فیصلہ کیا اور سال بچانے کی غرض سے بی ایس سی میں داخلہ لے لیا (کامی کا مشاہدہ تھا کہ انھوں نے بہت سے ڈاکٹر حضرات کے نام کے ساتھ بی ایس سی بھی لکھا ہوا دیکھا ہے)۔ میر نے تمام نصاب کو پسِ پشت ڈال کر Hunter Diack کی کتاب One Hundred One Aids to Exam Success کا بغور مطالعہ کیا اور امتحان دے ڈالا، اس لیے ان کا نتیجہ بتلانے کی مطلق ضرورت نہیں، مگر وہ پھر بھی اچھے رہے، کیوں کہ ہم لوگ نصابی کتب پڑھ کر دوبارہ فیل ہوئے۔ انھوں نے اس ناکامی کا ذمہ دار

اپنے بجائے فاضل مصنف کو ہی ٹھہرایا کہ اس نے پوری کتاب میں نصاب کے بارے میں جان بوجھ کر تغافلِ عارفانہ سے کام لیا ہے۔ نیز اس کی کتاب پر تنقیدی مقالہ تحریر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ناکامیوں کا نچوڑ کتابی شکل میں شائع کرنے کا بھی پروگرام بنایا۔

بار بار امتحان دینے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہم کمپارٹ کی اصلیت کو پا گئے، یعنی جس طرح گرفتاری کے بعد جیل میں نیک اعمال کرنے کی برکت سے اکثر اوقات مجرموں کی سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی جاتی ہے، اسی طرح طالب علم بھی اپنے کسی ناکردہ گناہ کی پاداش میں مکمل طور پر فیل ہونے سے محفوظ رہتا ہے، اور ایک آدھ مضمون میں ناکام ہو کر اسے سپلیمنٹری میں بیٹھنے کا موقع ہاتھ آ جاتا ہے، جسے عمر قید کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے۔ یوں اُس کا سال ضائع ہونے سے اور ناک کٹنے سے بچ جاتی ہے، پاس بھی نہیں ہوتا اور اگلی جماعت میں داخلے کی صورت میں ترقی بھی پا جاتا ہے۔ گویا اس کی مثال اُس دولھا کی سی ہوتی ہے، جس کا نکاح تو ہو جاتا ہے، مگر رخصتی تا حکمِ ثانی مؤخر کر دی جاتی ہے۔ نیز جس طرح لڑکی اپنے گھر پر ہی رہتی ہے اور دونوں خوش ہوتے رہتے ہیں کہ وہ شادی شدہ ہیں، اسی طرح ڈگری بورڈ والوں کے پاس رہن رکھی رہتی ہے، مگر طالب علم تصورات میں خود کو کامیاب ہی گردانتے رہتے ہیں۔ اور پھر جس طرح تاریخ طے ہونے پر لڑکے کو لڑکی کی تحویل میں دے دیا جاتا ہے، اسی طرح ایک مضمون کا قرض چکانے پر ڈگری طالب علم کے حوالے کر دی جاتی ہے۔

تیسری بار امتحان دیا تو نتیجہ نکلنے پر ہم پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ افسوس اپنے ایک قیمتی سال کے ضائع ہونے کا نہیں، اس بات کا تھا کہ دوسرے تمام دوست، جن میں عرفی اور کامی سرِ فہرست تھے، کیوں پاس کر دیے گئے۔ شام کو کامی کے ساتھ اپنی مسلسل ناکامی پر افسوس کرتے ہوئے باہر نکلے تو ایک پرانے واقف مل گئے۔ شکل دیکھتے ہی انھوں نے ہمارا شغل دریافت کیا۔ ابھی کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ کامی بولے، ''جی یہ وقتاً فوقتاً ایف ایس سی کا امتحان دیتے رہتے ہیں۔'' بہر حال جب تک ہم پاس ہوئے، اس وقت تک میر بی ایس سی (پارٹ ون) میں فیل ہو چکے تھے۔ کامی جو ہمارے انتظار میں ایک سال سے اپنی مٹھائی اور تعلیم روکے بیٹھے تھے، کامیابی کی خبر سنتے ہی خوشی خوشی مبارک باد دینے آئے اور ایک نیا انکشاف کیا کہ ڈاکٹر بننے کے لیے میڈیکل کالج میں جانے کی ضرورت نہیں، اب ہم پی ایچ ڈی کریں گے، اس طرح ڈاکٹر بھی کہلائیں گے اور مریض بھی نہیں دیکھنے پڑیں گے۔ پھر وہ تو اپنے لیے لڑکی بھی پسند کر چکے ہیں، لہٰذا اب فضول محنت کر کے ڈاکٹر بننے سے کیا فائدہ۔ کامی کے ایما پر ہم نے سائنس چھوڑ کر بی اے میں داخلہ لے لیا تو میر بھی ہمارے ساتھ آ ملے اور خوب زور شور سے امتحان دیا، مگر نتیجہ نکلتے ہی ایسے روپوش ہوئے کہ آج تک لاپتا ہیں:

تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا، پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

اسلام آباد 1975ء

والد صاحب کی میزبانی میں پندرہ دن

(سفرنامہ)

کالج میں گرمیوں کی چھٹیوں کا اعلان ہوا تو کامی نے کیفے ٹیریا میں داخل ہوتے ہوئے سیر و تفریح کا ارادہ ظاہر کیا، اور جگہ کے انتخاب کے لیے رائے طلب کی۔ عرفی بھی ساتھ تھے۔ انھوں نے سوات کا نام لیا تو کامی نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ سوات وہ فلموں میں بارہا دیکھ چکے ہیں۔ کاغان چلنے کو کہا تو بولے، وہاں کے کئی خوب صورت مناظر اُن کے ڈرائنگ روم میں آویزاں ہیں، جب بھی جانے کو جی چاہتا ہے، انھیں دیکھ کر پیسے بچا لیتے ہیں۔ لاہور کے بارے میں دریافت کیا تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ تاریخی شہر ہے اور تاریخ سے انھیں صرف اپنی شادی کی حد تک دل چسپی ہے۔ جب کامی نے ایک ایک کر کے عرفی کی بتائی ہوئی تمام جگہوں کو کسی نہ کسی بنا پر رد کر دیا تو ہم نے ڈرتے ڈرتے گلگت کا نام تجویز کیا۔ یہ سنتے ہی چائے کی پیالی ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ پہلے تو انھوں نے ہماری طویل خاموشی کی بھرپور مذمت کی، لیکن پھر تین چائے اور ایک پیالی کی ادائیگی کا مطالبہ کرتے ہوئے فوراً ہی منظوری دے دی۔

اب یہ فیصلہ کرنا باقی تھا کہ وہاں کس طرح جایا جائے۔ کامی نے یہ کہتے ہوئے ہوائی سفر اختیار کرنے کا مشورہ دیا کہ بس دریا میں گر گئی تو کسی کو لاش تک نہ ملے گی، اور اگر مل بھی گئی تو دیکھنے والے یہی کہیں گے کہ عجب آزاد مرد تھا۔ اس کے برخلاف اگر جہاز حادثے کا شکار ہو گیا تو اگلی ہی صبح تمام اخبارات میں نہ صرف شہ سرخیوں کے ساتھ خبر چھپے گی، بلکہ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر نام بھی بتائے جائیں گے، اور اگلے ہوائی حادثے تک اخبارات اسی خبر کو کسی نہ کسی حوالے سے شائع کر کے ہماری یاد دلاتے رہیں گے۔ اگر تینوں میں سے کوئی زندہ بچ گیا تو اُس خوش قسمت کا انٹرویو بھی نشر و اشاعت کے لیے پیش ہوگا۔ پھر مستقبل میں رشتہ دار بھی یہ کہہ کر یاد کیا کریں گے کہ مرحوم بچپن ہی سے جہاز میں سفر کیا کرتے تھے، کئی بار سمجھایا، مگر باز نہ آئے۔ ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ موت کا ایک دن اور سواری معین ہے، اگر بذریعہ جہاز ہی آنا ہوئی تو کوئی نہیں روک سکتا۔ نیز ہوائی سفر کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی اپنی منزل پر (خواہ وہ آخرت کی ہی کیوں نہ ہو) جلد پہنچ جاتا ہے۔ ان کی پیش کردہ یہ تاویل ہم لوگوں کو بہت پسند آئی اور سب نے بس کے بجائے جہاز سے گرنا زیادہ مناسب سمجھا کہ فائدہ اس زیان میں کچھ ہے!

ہمارے والد ایک سرکاری محکمے میں ملازم تھے، وہاں ایمان دار آدمی کا جو حشر ہوا کرتا ہے، وہ اُس سے گزرتے ہوئے گلگت میں دو سال کی قیدِ بامشقت کاٹ رہے تھے، اس لیے اعلیٰ رہائش، عمدہ کھانے، لذیذ چائے اور ہوادار کمروں کا معقول انتظام تھا۔

ایئر پورٹ پہنچے تو معلوم ہوا، موسم بہت خراب ہے، پہاڑوں پر موسلا دھار بارشوں کا سلسلہ جاری ہے اور جہاز گلگت میں پھنسا ہوا ہے۔ اُسے باور کرایا جارہا ہے کہ راول پنڈی واپس آجاؤ، تمھیں کچھ نہیں کہا جائے گا، مگر وہ اپنی ضد پر اڑا ہوا ہے، اس لیے تاحکمِ ثانی اپنے ٹکٹ حفاظت سے رکھے جائیں۔ کامی کو عملے کی بدذوقی پر سخت غصہ آیا کہ اتنے خوش گوار موسم کو خراب کہہ رہے ہیں۔ کئی روز تک یہی ہوتا رہا حتیٰ کہ 20 رمئی سے 2 رجون آ گئی۔ اب تو کامی کو شک ہو گیا کہ جہاز گلگت جاتا ہی نہیں ہوگا، یہ لوگ ہمیں یوں ہی بے وقوف بنا رہے ہیں۔ انھوں نے اسی وقت ٹکٹ واپس کر کے کوئی اور پروگرام بنانے کا حکم صادر فرما دیا۔ بکنگ آفس پہنچے تو خوش خبری ملی کہ صبح کا بھولا کل شام واپس آ گیا ہے، مگر کامی بضد رہے کہ پہلے جہاز نہیں جارہا تھا، تو اب ہم نہیں جارہے۔ بہر حال عملے والوں کے سمجھانے پر کہ بہتری اسی میں ہے کہ ٹکٹ واپس نہ کیے جائیں (گیا جہاز پھر ہاتھ آتا نہیں!) وہ جلد ہی مان گئے اور یوں ہم اس روز جہاز پر سوار ہو گئے۔

جہاز میں بیٹھتے ہی کامی کا موڈ کافی خوش گوار ہو گیا۔ پہلے تو انھوں نے ہمارے، ایمان دار باپ کا بیٹا ہونے پر رشک کیا، پھر والد صاحب کو ڈھیروں دعائیں دیتے ہوئے اس امر کا اظہار کیا کہ بزرگوں کی نیکیوں کے ثمرات صرف ان کی اپنی اولادوں ہی کو نہیں، بلکہ بچوں کے دوستوں کو بھی منتقل ہوتے ہیں، اس لیے اگر اور لوگ بھی عبرت پکڑیں اور ایمان داری سے کام کریں تو انھیں بھی سرکاری خرچ پر ایسے دور دراز مقامات کی سزا نصیب ہو! اتنے میں چائے آ گئی۔ کامی نے اسٹیورڈ کو دیکھتے ہی حقارت سے اپنا منھ پھیر لیا اور اس کے ہاتھ سے چائے پینے کے بجائے خون کے گھونٹ پینے کو ترجیح دی، پھر ہم لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے غصے میں، مگر آہستگی سے بولے: ''میں نہ کہتا تھا کہ عورت (چاہے ایئر ہوسٹس ہی کیوں نہ ہو) صرف اچھے وقت کی ساتھی ہے، دشوار گزار راستوں میں مرد کا ساتھ ہرگز نہیں دے سکتی!''

تین بجے ہم گلگت میں تھے۔ جہاز میں ایئر ہوسٹس کی طرح ایئر پورٹ پر والد صاحب بھی غائب تھے۔ نئی جگہ، ان جانے چہرے، پریشان ہو گئے کہ کہاں جائیں۔ واپسی کا کرایہ بھی والد صاحب کے پاس تھا۔ اتنے میں کامی کو کچھ شک سا ہوا اور اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہمارے قریب آئے:

''تمھارے والد صاحب یہیں ہیں ناں؟'' ہم ٹپٹا گئے۔

''انھوں نے کسی چھوٹی ایمان داری کا ارتکاب کیا تھا، یا بڑی؟''

''چھوٹی سی ہی تھی۔ خرچ کا حساب لکھتے وقت تین گیلن کو صرف تین سو گیلن لکھنے سے ہی تو معذوری ظاہر کی تھی۔''

''پھر تو وہ ضرور یہیں ہوں گے!''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' عرفی بھی ٹہلتے ہوئے اس طرف آ نکلے۔

''اس لیے کہ میرے چچا نے تیس روپے کو تیس ہزار لکھنے سے انکار کیا تھا تو وہ اسکردو میں تعینات ہوئے، جو یہاں سے کافی آگے ہے اور میرے سفر کی اگلی منزل بھی ہے۔'' عرفی کا کہنا تھا کہ صفر لگانے سے آدمی "suffer" نہیں کرتا، اس لیے لگا دینا چاہیے، مگر کامی کا اصرار تھا کہ سفر وسیلۂ ظفر ہے، اس لیے ضرور کرنا چاہیے!

اچانک والد صاحب پر نظر پڑی، جن کے ماتھے سے پسینہ اور چہرے سے غصہ ٹپک رہا تھا۔ ہم دوڑتے ہوئے ان کی طرف لپکے اور سلام کرنے کے بعد چپ چاپ جیپ میں سوار ہو گئے۔

''لگتا ہے ان کو تمھارے آنے کی خوشی نہیں ہوئی، والد صاحب سے تعلقات تو ٹھیک ہیں ناں!'' کامی نے ہمیں کہنی ماری۔ اتنے میں والد صاحب نے سگریٹ کھڑکی سے باہر پھینکا اور اپنا رخ ہم لوگوں کی طرف کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے ہمسائے نے، جو ایئر پورٹ پر کام کرتے ہیں، غلط اطلاع دی کہ جہاز ابھی تک یہیں کھڑا ہوا ہے، جب کہ وہ کل شام یہاں سے جا چکا تھا۔ اگر ہماری خیریت دریافت کرنے کے لیے راول پنڈی سے والدہ کا فون نہ آتا تو انھیں ہماری آمد کا پتا بھی نہ چلتا۔ پھر آہستہ آہستہ والد صاحب نے ہنسی مذاق شروع کیا۔ ہم لوگ سطحِ سمندر سے 4770 فٹ کی بلندی پر ہوتے ہوئے بھی، ان کا حوصلہ اتنا بلند دیکھ کر حیران رہ گئے۔

سرسبز و شاداب علاقوں سے ہوتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا دسترخوان بچھا ہوا ہے اور اس پر سلیقے سے چائے کے برتن لگے ہوئے ہیں اور لوازمات، جن میں پھل اور ڈرائی فروٹ نمایاں تھے، رکھے ہوئے ہیں۔ جلدی جلدی منھ ہاتھ دھویا، کپڑے تبدیل کیے اور فرش پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں ساتھ والوں کی لڑکی (جن کا تعارف جیپ میں ہو چکا تھا) چائے کی ٹرے تھامے اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی کامی نے ہماری محبت میں اسکردو جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے یہیں قیام کرنے کا پروگرام بنایا، کہ وہاں ہمارے بغیر اُن کا دل نہیں لگے گا! عرفی نے ان کے چہرے سے رکنے کی اصل وجہ بھانپتے ہوئے صرف دل لگی تک محدود رہنے کی ہدایت کی کہ کل کلاں کو موصوف (لڑکی کے والد) انھیں بھی بیٹی کے بارے میں غلط اطلاعات فراہم کر کے خواہ مخواہ پریشان نہ کریں، جس طرح سے ہمارے والد صاحب کو جہاز کے باب میں کیا تھا!

چائے پیتے ہی ہم لوگ شہر کی سیر کو نکل کھڑے ہوئے۔ گلگت شمالی علاقہ جات کا سب سے بڑا شہر اور چینی سامان کی بہت بڑی منڈی ہے۔ یہاں پر شنا زبان بولی اور پولو کھیلی جاتی ہے۔ دریا کے کنارے بلند و بالا پہاڑوں سے گھرا شہر کسی پیالے کا سا سماں پیش کرتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اس حصار سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہاں کا چنار باغ بھی قابلِ دید ہے۔ پاکیزہ سا ماحول، بازاروں اور گلیوں سے عورتیں اور لڑکیاں غائب۔ جو تھوڑی بہت موجود، وہ بے سود! بے پردگی نام کو نہیں، چھوٹی چھوٹی بچیاں تک گلیوں میں کھیلتی نظر نہ آئیں، یعنی وجودِ زن کے بغیر تصویرِ کائنات میں رنگ! کامی جو کسی موقعے پر نہیں چوکتے کہنے لگے، یہاں غربت زیادہ ہے، اس لیے عورتیں بے چاری خالی ہاتھ گھر سے نکلتے ہوئے گھبراتی ہوں گی۔ راول پنڈی میں دیواروں پر جا بجا لکھا دیکھا تھا کہ خواتین دوپٹہ سر پر رکھیں، برقعہ اوڑھ کر چلیں، لیکن اس کا اثر یہاں دیکھا۔ عرفی نے اس فارمولے کی رو سے رائے پیش کی کہ اگر یہی کلمات کسی طرح بمبئی، زاہدان، کابل، جموں اور امرتسر کی دیواروں پر لکھوا دیے جائیں تو اس کے اثرات پورے ملک میں ظاہر ہوں گے۔ دکان دار اصول اور نماز کے پابند مثلاً، اگر مچھلی کی قیمت آٹھ روپے فی کلو مقرر ہو گئی تو اب وہ اسی قیمت پر فروخت ہو گی، خواہ رمضان المبارک کا چاند نظر آ جائے، یا رکھے رکھے خراب ہو جائے! دوسری صورت میں قیمت تبدیل کرنے کے بجائے دریا کی امانت شکریے کے ساتھ اسے واپس لوٹا دی جاتی ہے: جان دی، دی

ہوئی اسی کی تھی! جیسے جیسے نماز کا وقت قریب آتا جاتا ہے، بازار مزید ویران ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ مسجدوں میں جوتے چوری ہونے کا ڈر نہیں۔ اپنا دھیان جوتوں کے بجائے نماز میں لگا کر اطمینان سے عبادت کا لطف لیں۔ مسجد میں کوئی قیمتی چیز رہ جائے تو پریشان ہونے کی مطلق ضرورت نہیں، جس کسی کو بھی ملے گی وہ امام صاحب کے پاس جمع کرا دے گا، جسے وہ نماز کے بعد باقاعدہ اعلان کر کے اس کے حقیقی مالک کو لوٹا دیں گے۔

اگلے روز والد صاحب اپنے مقامی دوستوں سے ملوانے کے لیے ان کی دکانوں پر لے گئے۔ ہم لوگوں نے ان کی تواضع سے متاثر ہو کر بدلے کی نیت سے وہاں کئی چھوٹی موٹی چیزیں پسند کر لیں۔ چلتے وقت ادائیگی کرنے لگے تو ہر دکان دار کا جواب یہی تھا کہ وہ کسی قیمت پر بھی ان اشیا کی قیمت وصول نہیں کر سکتا، کیوں کہ ہم ان کے ملک اور دکان میں پہلی بار آئے ہیں۔ کبھی دوبارہ تشریف آوری ہوگی تو دیکھا جائے گا، مگر افسوس ہم لوگ وقت کی زیادتی کے باعث کسی کو بھی دوسرا موقع فراہم نہ کر سکے اور ہر بار کسی نئی دکان پر، پہلی بار جا کر، مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے رہے! جب تک وہاں قیام رہا، دن میں بازار اور شام کو چنار باغ ضرور جاتے، بلکہ کامی تو دنوں کا حساب بھی دکانوں کی تعداد سے لگانے لگے مثلاً، آج ہمیں آئے ہوئے گیارہ دکانیں ہوگئی ہیں، اب جانے میں صرف چار دکانیں باقی رہ گئی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

ایک روز شام کی چائے پر والد صاحب نے بتایا کہ اسلام آباد سے ان کے ایک دوست سیر و سیاحت کی غرض سے شہر میں داخل ہو چکے ہیں اور انھوں نے بڑی محبت سے ہمیں اپنے ساتھ لے جانے کی پیش کش کی ہے۔ یوں اگلے روز تینوں خنجراب (پاک چین سرحد) دیکھنے کے لیے روانہ ہو گئے۔

گلگت سے نکلتے ہی موسم کافی سرد ہو گیا۔ آسمان پر حدِ نظر تک بادل چھائے ہوئے تھے اور پہاڑوں پر ہر طرف خوبانیاں بکھری ہوئی تھیں، جو سکھانے کی غرض سے وہاں پھیلائی گئی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ راستے میں جا بجا سیب، بادام اور آڑو کے باغات ملے۔ یہ تمام علاقہ ہی سرسبز اور خوب صورت ہے اور مقبوضہ کشمیر کو شرماتا ہے (آزاد کشمیر البتہ اس سے شرماتا ہے)۔ غرض انھی مرغزاروں سے ہوتے ہوئے تقریباً شام چھ بجے آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع خوب صورت مقام ہنزہ (کریم آباد) پہنچے۔ یہ علاقہ گلگت کی نسبت جتنا ٹھنڈا ہے، اتنا ہی غیر آباد بھی ہے۔ آب و ہوا اچھی ہے، اس لیے بیماری کی طرح موت کا گزر بھی کم ہی ہوتا ہے۔ اور چوں کہ موت عموماً بروقت ہی آتی ہے، اس لیے مرنے کے لیے ڈاکٹر کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی! یہی وجہ ہے کہ اس علاقے میں ڈاکٹر نہیں پائے جاتے۔ درازی عمر کی وجہ سیب کے آٹے کی روٹی اور اسلحہ کے بجائے پھلوں کا آزادانہ استعمال بتائی جاتی ہے۔ وہ سرخی جو ہمارے ہاں چہروں پر صرف غصے کی حالت میں نمودار ہوتی ہے، یہاں پر عام دیکھنے میں آتی ہے۔ ہنزہ میں ایک چھوٹا سا عجائب گھر اور سنگِ مرمر کا قلعہ بھی ناقابلِ دید ہے۔ یہ ہمارے سفر کی پہلی کڑی تھی، رات یہاں بسر کر کے اگلے روز خنجراب کے لیے روانہ ہونا تھا۔

ریسٹ ہاؤس میں سامان رکھا، گرم گرم چائے پی اور باہر نکل گئے۔ اتفاق سے بجلی گئی ہوئی تھی، اس لیے سناٹے میں خوف سا محسوس

ہو رہا تھا۔ قریب سے ندی گزر رہی تھی۔ ہم لوگ ریتلی سڑک پر اُس کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگے۔ ندی کا سرمئی پانی زمین پر کسی قالین کا سا نمونہ بناتا ہوا تیزی سے بہتا چلا جا رہا تھا۔ گائیڈ کی زبانی معلوم ہوا کہ یہاں پانی بے بو اور بے رنگ نہیں ہوتا، بلکہ معدنیات کی ملاوٹ کے سبب خوش بودار اور رنگین ہو جاتا ہے اور سائنس دانوں کو جھٹلاتا ہے، جو اسے بے بو اور بے رنگ کہتے ہیں! نیز یہ پانی صحت کے لیے تو بے حد مفید ہے، لیکن ہمارے لیے ہرگز نہیں، کہ شہریوں کے معدے اسے ہضم نہیں کر سکتے، بلکہ بسا اوقات یہ انھیں ہضم کر جاتا ہے! بہتری اسی میں ہے کہ اسے زیادہ منہ نہ لگائیں اور تقطیر کیا ہوا پانی ہی استعمال میں لائیں۔ یوں ہی اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد ریسٹ ہاؤس پہنچے تو بھوک سے برا حال ہو رہا تھا، جو پر تکلف کھانا دیکھ کر اور چمک گئی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد باقی رات خوش گپیوں اور چائے پینے میں گزر گئی۔ صبح صبح جب کہ محفل کچھ سرد پڑ چکی تھی، چوکی دار ٹھنڈے ٹھنڈے شہتوت اور تازہ تازہ پھل لے آیا، جنھیں نہار منہ کھا کر طبیعت ایسی بحال ہوئی کہ رت جگے کا احساس تک نہ ہوا۔ ناشتہ کرتے ہی ہم لوگ اپنی اصل منزل (خنجراب) کی طرف روانہ ہو گئے۔

جیپ فراٹے بھرتی اور ہم خراٹے لیتے چلے جا رہے تھے کہ چچا (والد صاحب کے دوست) اچانک چلائے:

''وہ دیکھو، لال لال خرگوش، کیوں نہ جیپ روک کر اِن کا شکار کیا جائے... اور وہ دیکھو، پہاڑ کی چوٹی پر چھوٹی چھوٹی سی بکریاں۔''

اس پر ڈرائیور نے جو اتفاق سے وہیں کا رہنے والا تھا، بتایا کہ جن کو وہ خرگوش سمجھ رہے ہیں، وہ دراصل پہاڑی چوہے ہیں۔

''اور یہ جو بکریاں سی ہیں، یہ دراصل کیا ہیں؟''

ہم نے آنکھیں ملتے ہوئے سوال کیا۔

''یہ اصل میں یاک ہیں، جنھیں خوش گاؤ بھی کہتے ہیں۔ انھیں ہم دسمبر میں کاٹ کر رکھ لیتے ہیں اور سال بھر اِن کا گوشت کھاتے رہتے ہیں۔ چوں کہ موسم سارا سال سرد ہی رہتا ہے، اس لیے یہ خراب، یا بدمزہ ہونے نہیں پاتا۔''

''اس سے پہلے ہی چٹ کر جاتے ہوں گے۔''

کامی بھی انگڑائی لیتے ہوئے بیدار ہوئے۔ پھر ڈرائیور نے یاک پکڑنے کے طویل اور دل چسپ طریقے سے آگاہ کیا، جو کچھ یوں ہے:

یاک کو پکڑنے کے لیے پہلے ایک گہرا گڑھا کھود کر اُس کے اوپر گھاس پھونس ڈال دیا جاتا ہے۔ اب شکاری اُسے دیکھ کر بلاوجہ شور مچاتا ہے، جس سے یاک بدحواس سا ہو کر بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔ جیسے ہی وہ گڑھے کے اوپر سے گزرتا ہے، زندہ درگور ہو جاتا ہے۔ وہاں پر پہلے تو اُس کا جسمانی ریمانڈ لیا جاتا ہے، اور بغیر کسی جرم کے محض یاک ہونے کی بنا پر خوب مارا پیٹا جاتا ہے، پھر اپنی غلطی کا احساس ہونے پر اُسے پھلوں کی شراب پلائی جاتی ہے، تاکہ وہ مدہوش ہو کر مار پیٹ بھول جائے اور گرفتاری کے بعد شکاری کا جسمانی ریمانڈ نہ لے لے! کامی کو یاک کی قسمت پر بڑا رشک آیا کہ انسانوں کو تو شراب پینے کے بعد کوڑے لگائے جاتے ہیں، ہم سے تو یہ بے زبان یاک ہی اچھا ہے، مار سے فارغ ہو کر اطمینان سے شراب پیتا ہے! عرفی کہنے لگے چوں کہ اسے خوامخواہ مارا پیٹا جاتا ہے، اس لیے اتمامِ حجت کے طور پر بعد میں جرم اس سے خود ہی سرزد کرا لیا جاتا ہے، تاکہ روزِ قیامت شکاری کے منہ نہ لگے۔ اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ شکاری اس کے حصے کی شراب

خود پی لیتے ہیں۔ اب وہ شور مچا کر اُسے بھگانے کے بجائے مست ہو کر خود بھاگنا شروع کر دیتے ہیں اور گڑھے میں جا گرتے ہیں (چاہ کن را چاہ درپیش)۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور سے یاک کم اور شکاری زیادہ پکڑے جاتے ہیں۔ پھر اُسے سدھایا جاتا ہے اور بعد میں (اس کی جان لینے سے پہلے) مختلف نوعیت کے کئی کام لیے جاتے ہیں مثلاً زندہ یاک کوہ پیما پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرتے وقت اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور اس پر اپنا سامان لاد دیتے ہیں، کیوں کہ یہ کسی سہارے اور سفارش کے بغیر بہ آسانی اوپر جا سکتا ہے! غرض یاک پہاڑوں پر اونٹ کا بہترین نعم البدل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ اونٹ کی طرح کینہ پرور اور اونچا نہیں ہوتا، اور نہ ہی کسی محاورے میں استعمال ہوتا ہے! کامی کو شک ہے کہ کوہ پیما نظر بچا کر سامان کی آڑ میں خود بھی اس پر سوار ہو جاتے ہوں گے، اور یوں اونچی اونچی چوٹیاں بے چارہ یاک سر کرتا ہے اور نام وہ اپنا نشر کرا دیتے ہیں)۔ مرے ہوئے یاک کی دُم سے جھاڑن بنائے جاتے ہیں جو عموماً لال، کالے یا بھورے رنگ کے ہوتے ہیں

چند گھنٹوں کی مسافت کے بعد ہم لوگ سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر دریائے سنکیانگ کے کنارے واقع سرحدی علاقے خنجراب پہنچے۔ وہاں پر چینی گارڈ پوسٹ پر تعینات چینیوں سے ملاقات ہوئی، جن کے دانت سے دانت بج رہے تھے اور منہ سے سگریٹ پیے بغیر دھواں نکل رہا تھا۔ ہم لوگوں نے انھیں راستے سے اٹھائی ہوئی گلگت کی مشہور بادام خوبانیاں پیش کیں اور انھوں نے ہمیں بغیر چینی کی سبز چائے پلائی (بقول کامی چوں کہ وہ خود ہی چینی ہیں، اس لیے چینی استعمال نہیں کرتے)۔ یہاں پر سخت سردی تھی، تھوڑی دیر بعد ہماری بھی وہی کیفیت ہوگئی۔ سانس لینے میں سخت دشواری ہو رہی تھی، حتیٰ کہ ٹھیک سے بات تک نہ ہو پا رہی تھی۔

(بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی!) تھوڑی دیر دریائے سنکیانگ پر چہل قدمی کی۔

دشت تو دشت، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے!

چند ہی منٹ بعد واپسی کا سفر شروع ہوگیا۔ کچھ دور جا کر ذرا حواس بحال ہوئے تو کامی نے رائے پیش کی کہ ہمارے ملک میں برف کی فیکٹریاں لگانے کی مطلق ضرورت نہیں، خنجراب کے علاقے سے برف نکال کر نہ صرف اندرونِ ملک بھیج کر بجلی اور پانی کے مسئلے پر قابو پایا جا سکتا ہے، بلکہ دوسرے ممالک کو برآمد کر کے توازنِ ادائیگی کو بھی بہتر بنایا جا سکتا ہے، مگر عرفی نے انھیں پہلے اپنا دماغی توازن درست کرنے کا مشورہ دیا۔ راستے میں ایک آبشار کے نیچے بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ روایات کے مطابق یہ آبشار وہاں پر PWD کے فرائض انجام دے رہی ہے، یعنی اِدھر انجینئرز نے سڑک بنائی، اُدھر اس نے اپنے ترقیاتی کام کا آغاز کر دیا!

ایک دن کرنے کو کچھ نہ تھا تو عرفی کہنے لگے، کیوں نہ آج پولو گراؤنڈ کی طرف چلیں۔ اُن دنوں علاقائی مقابلے زوروں پر تھے اور اُن کا کوئی ٹکٹ وغیرہ بھی نہیں تھا۔ سوچا سستا سا کھیل ہے، دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اس کھیل کا اب تک صرف نام ہی سن رکھا تھا۔ عرفی نے، جو تاریخ میں کافی دل چسپی رکھتے ہیں، اور تحقیق ان کا مشغلہ ہے، سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس رمز سے آگاہ کیا کہ ابتدا میں اس کھیل کا نام دراصل پولیو تھا (جس سے اب ڈاکٹر کھیلتے ہیں!) جو بگڑتے بگڑتے اب پولو رہ گیا ہے۔ اور یہ عموماً وہ لوگ کھیلا کرتے تھے، جو بچپن میں پولیو کا شکار ہو کر دوڑنے بھاگنے سے معذور ہو جایا کرتے تھے۔ وہ ہاکی یا فٹ بال کھیلنے کے بجائے آرام سے گھوڑوں پر بیٹھ کر پولو کھیل لیتے تھے لیکن

پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی دل چسپی کے سبب یہ کھیل اتنا مقبول ہوا کہ اب اسے کھیلنے سے پہلے پولیو ہونا ضروری نہیں، صرف گلگت و بلتستان میں ہونا کافی ہے۔ نیز یہ کہ اس کھیل کا نام سن کر مارکو پولو اتنا خوش ہوا کہ تادمِ مرگ گھوڑے پر ہی سوار رہا۔

واپسی سے قبل شام کو والد صاحب کے ہمراہ ایک مقامی شادی میں شرکت کرنے کا اتفاق ہوا۔ ہم لوگ سج دھج کر، مگر کامی ایسے ہی وہاں پہنچ گئے کہ یہاں کپڑے کس کے لیے بدلوں! کچھ ہی دیر بعد والد صاحب کے ہمسائے بھی اپنے بچوں کو لے کر وہیں پہنچ گئے، تو وہ سخت پشیمان ہوئے اور فوراً عرفی کی واسکٹ اُتروالی۔ پھر رفتہ رفتہ دکان داروں سمیت وہ سب لوگ آنا شروع ہوئے، جن سے گزشتہ دو ہفتے کے دوران کہیں نہ کہیں ملاقات یا علیک سلیک ہوئی تھی۔ گورنمنٹ اسکول کے ہال میں شادی کا بندوبست دیکھتے ہی کامی دولھا دلھن کے مستقبل کی طرف سے بالکل مایوس ہوگئے۔ مہمانوں کے لیے فرشی نشست کا انتظام تھا۔ ابھی بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ فائرنگ شروع ہوگئی۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ آمدِ بارات کی نوید ہے، ورنہ ہم تو سمجھے تھے کہ ''اب یہ شادی ہرگز نہیں ہوگی!'' سب لوگ کھڑے ہوئے تو ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے استقبال کے لیے اسکول کے صدر دروازے کی طرف چل دیے۔ عرفی نے اسکول کے برآمدے کی دیوار پر جلی حروف سے غالبؔ کا یہ شعر لکھا دیکھا تو انتظامیہ کے ادبی ذوق پر اَش اَش کر اٹھے اور اسے پڑھ کر دیر تک جھومتے رہے:

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے

نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

ہم نے بھی اس کی تعریف کی تو ڈانٹا کہ یہاں کوئی مشاعرہ نہیں ہو رہا ہے، جو شعر سنتے ہی بغیر سوچے سمجھے داد دے ڈالی، اصل مطلب بتاؤں گا تو لطف آجائے گا۔ پھر انھوں نے وہیں کھڑے کھڑے اس شعر کا رشتہ تاریخ سے جوڑتے ہوئے پہلے تو یہ سمجھانے کی کوشش کہ اب ادب بھی تاریخ کا حصہ بنتا جا رہا ہے (شاید اس لیے کہ اب کوئی کسی کا ادب نہیں کرتا!) اور پھر یہ راز افشا کیا کہ اس شعر کے دوسرے مصرعے سے غالبؔ کا تیز رفتار ویگنوں اور بسوں میں سفر کرنا ثابت ہوتا ہے۔ کامی ان سے بھی دو ہاتھ آگے نکلے اور انھوں نے عرفی سے اتفاق نہ کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ اس میں مرزا نے دولھا کی بے بسی کی انتہائی مؤثر تصویر کشی کی ہے۔ یہ برمحل تشریح سب کو بہت پسند آئی اور سب دیر تک ہنستے رہے۔

بارات آئی اور نکاح ہوا۔ دوبارہ گولیاں برسائی گئیں تو کامی نے فائرنگ کو اس امر کی نشان دہی قرار دیا کہ اگر لڑکے نے اپنی بیوی پر کبھی ظلم کیا تو اسے فوراً اڑا دیا جائے گا۔ قریب بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے سنا اور اصلاح کی کہ یہ یہاں کی رسم ہے تو وہ کھسیانے سے ہو رہے۔ نکاح کے بعد دولھا نے تقریباً تمام مہمانوں سے نہ چاہتے ہوئے بھی فرداً فرداً مصافحہ کیا۔ پھر چھوہاروں کی قائم مقام کھلیں پھینکی گئیں۔ اچھا ہی ہوا، اگر اس طرح چھوہارے برسائے جاتے تو کئی لوگ بے ہوش نہیں تو زخمی ضرور ہو جاتے۔ کچھ ہی دیر بعد بڑے بڑے برتنوں میں کھانا چنا گیا جو چاول، آلو گوشت اور سبزی پر مشتمل تھا۔ کئی کئی لوگوں نے ایک ہی طباق میں کھایا۔ کھانا بہت ہی لذیذ تھا، اس لیے سب نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ کامی کو کھانا کھلانے کا یہ طریقہ بے حد پسند آیا کہ اس طرح زیادہ کھا جانے والے حضرات لوگوں کی نظر میں نہیں

آتے!۔کھانا شام چار بجے شروع ہو کر شب نو بجے تک جاری رہا، کیوں کہ تقریباً پوری برادری (بلکہ تمام شہر) کو امیر و غریب کا امتیاز کیے بغیر مدعو کیا گیا تھا۔ یہ فیصلہ مہمان کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ دن کا کھانا پسند کرے گا، یا رات کا، یا دونوں!

اگلے روز واپسی کا سفر شروع ہوا تو والد صاحب بھی ساتھ ہو لیے کہ یہاں پر بھی ان کی دال نہ گل سکی، اس لیے اب انھیں مزید اصلاح کے لیے پہاڑ کی ڈھلوان سے ہری پور (ہزارہ) کی طرف لڑھکایا جا رہا ہے۔ کامی نے سنا تو جیپ میں سوار ہوتے ہوئے بولے:

''پہاڑوں پر ہوا کا دباؤ بہت کم ہوتا ہے، اس لیے یہاں دال ذرا دیر سے گلتی ہے'' اور پھر والد صاحب کو باہر کا اچھا سا پریشر ککر خریدنے کا مشورہ دیا، جو گلگت میں عام دستیاب تھا۔

ہری پور (ہزارہ) 1975ء

لڑکی کسی کی پاس ہو یا امتحاں رہے!

(اہلیہ سے معذرت کے ساتھ)

بی اے کے امتحان سے فارغ ہو کر کامی کے ہاں پہنچے تو دیکھا وہ کتاب ہاتھ میں لیے کچھ بڑبڑا رہے ہیں:

''پرچہ خراب ہو گیا ہے کیا...؟''

''نہیں، امتحان ختم ہوتے ہی ایک ٹیوشن مل گئی تھی، اور فی الحال ذرا فعل حال یاد کر رہا تھا۔''

''لڑکا ہے، یا لڑکی؟''

''کوایجوکیشن!''

''پھر تو تمھارے مزے آ گئے۔''

''کہاں یار لڑکی میرے قابو سے باہر ہے، البتہ میں پوری طرح لڑکے کے قابو میں ہوں، جو میرے سوا کسی اور کے ہاتھوں برباد ہونے کو تیار نہیں (کتاب پر نظریں جماتے ہوئے) سوالیہ فقروں کے شروع میں Do یا Does لگاتے ہیں''

پھر ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے:

''Do you teach the girl?''

''اگر لڑکی اس جملے کی طرح بے ہودہ نہ ہو تو!''

''منفی فقروں میں فاعل کے بعد Do Not یا Does Not کا اضافہ کرتے ہیں (کتاب بند کرتے ہوئے) لڑکی کے متعلق تم بے فکر رہو، ایک نظر بھی دیکھ لیا تو بلا معاوضہ ہی تیار ہو جاؤ گے۔''

یہ سن کر اُسے پڑھانے کا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے اسی وقت کتاب پھینکی اور ہمیں لڑکی کے والد سے، جن کو خود بھی ابو کہنا شروع کر دیا تھا، ملوانے لے گئے۔ انھوں نے اپنی بیٹی کو آواز دی تو اچانک کامی کی بات یاد آ گئی اور ہم نے انھیں بات طے کرنے کا مشورہ دیا کہ تعارف بعد میں ہوتا رہے گا۔ چوں کہ امتحان سر پر تھا اور لڑکی پچھلے سال ناکامی کا منھ دیکھ چکی تھی (اور اس سال کامی کا منھ دیکھنے کو تیار نہ تھی) اس لیے حسب منشا سب کچھ فوراً ہی طے ہو گیا۔

بہ ہر حال رات کو کروٹیں اور صبح کو کپڑے بدل کر ٹھیک ساڑھے نو بجے اسے پڑھانے کے لیے پہنچ گئے۔ وہ کتابیں تھامے

مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور سلام کر کے نظریں جھکائے چپ چاپ بیٹھی کاپی پر یونھی پینسل چلانے لگی۔ ہم اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتے ہوئے بہت دور نکل گئے۔ دبلی پتلی، بھولی بھالی اور سیدھی سادی۔ نازک اتنی کہ گر پڑے تو ٹوٹ جائے، لمبا قد، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، جن کے گرد کاجل سے لکیر بنی ہوئی، رنگ سانولا، مگر پرکشش، تھوڑی پر ایک طرف ننھا سا تل، جسے سرمے سے مزید ابھارا ہوا تھا، ناک میں طلائی چھلا۔ اوپر کے دانتوں میں دائیں طرف کو ایک چھوٹا سا دانت اور نکل آیا تھا جس کے باعث ہنستے ہوئے اتنی پیاری معلوم ہوئی کہ جی بے اختیار ہو گیا۔ (کامی اُس کے اِس نئے دانت سے سخت پریشان تھے۔ کہتے تھے، اس کے تینتیس دانت ہیں، اس لیے جتنی بھی محنت کرلو یہ "Passing Marks" سے زائد نمبر نہیں لینے کی!)۔ زلفیں اتنی لمبی نہ تھیں کہ صیاد آپ اپنے دام میں آسکتا، البتہ ہمارے لیے کافی تھیں۔ غرض فی پختگی میں غالب کی غزل کو بھی پیچھے چھوڑ گئی تھی۔ خدا پر ایمان جو اُس وقت کسی قدر متزلزل تھا، اسے دیکھ کر قدرے مضبوط ہو گیا، کہ ایسی حسین تخلیق کسی غیبی قوت کا کرشمہ ہی ہو سکتا ہے۔ پھر کچھ ایسی شکلیں بھی دیکھیں کہ جن کے دیکھنے سے ایمان مزید پختہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ صرف خوب صورت چیزیں بنانے پر ہی قادر نہیں!)۔ اس پری وش کا اُردو غزل پر بہت بڑا احسان ہے، کیوں کہ اسے دیکھتے ہی ہم شاعری کرنا بھول گئے۔

اچانک اس نے سر اٹھایا تو ہم نے چونک کر نصاب سے متعلق رسماً چند سوال کیے۔ پھر کامی کی بدبختی پر آنسو بہاتے ہوئے اسے اپنے طریقہ تدریس سے آگاہ کیا تو آنکھیں چار کرتے ہوئے بولی:

''ہاں تو میں آپ کا دیا ہوا کوئی کام نہیں کروں گی، میرا ہوم ورک بھی آپ کو ہی کرنا ہوگا۔ کتاب بھی نہیں پڑھوں گی، کتابیں بھی آپ ہی کو پڑھ کر سنانا ہوں گی۔''

''امتحان تو آپ خود ہی دیں گی نا؟؟؟''

ہم نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

''ہاں تو اور کیا آپ سے دلوا کر دوبارہ سال ضائع کرنا ہے، آپ سبق یاد کر سکتے تو آج ٹیچر کے بجائے ڈاکٹر یا انجینئر ہوتے۔!''

''اگر ہمارا دیا ہوا کام نہ کیا، تو ہم سختی کریں گے۔''

''پتا ہے، پچھلے سر نے ناں (مشارٌ الیہ کامی ہیں) ہم پر تھوڑی سی سختی کی تھی تو ہم نے ابو سے کہہ کر اگلے ہی روز آپ کے لیے اسامی خالی کرادی، کیا سمجھے؟''

''یہی، کہ اگر ہم نے بھی پڑھانے کی کوشش کی تو یہ اسامی پھر کسی اور کے لیے خالی کر دی جائے گی۔''

کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

اسی شام کامی سے ملاقات ہوئی اور انھیں تمام روداد سنائی تو چیختے ہوئے بولے:

''بے فکر رہو، وہ خود کچھ بھی نہیں کرنے کی۔''

''شادی بھی نہیں کرے گی...؟''

''اگر شادی کی بھی تو مجھے یقین ہے کہ بچے شوہر سے ہی جنوائے گی۔''

اس کی خاطر یہ کام بھی کرنے کی ضمانت دی تو کامی اور غصہ ہوگئے، کہ پہلی ہی ملاقات میں اس کے بارے میں اتنا بڑا فیصلہ کیسے کرلیا۔ جب انھیں نرمی سے سمجھایا کہ ہم اس راہ پر بغیر کسی سواری کے بہت دور نکل گئے ہیں، اور اب اسے پڑھائے بغیر ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتے، تو انھوں نے ایک ہی دن میں اتنی لمبی مسافت طے کرنے پر (جواُن کے خیال میں ہمارے ہاں کسی بھی ذریعے سے ممکن نہیں ہے!) اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ پھر ہنستے ہوئے بولے:

''یہ لڑکی مجھے چال چلن کی اچھی لگی، اس لیے میں نے چال چلی اور اسے شرف تلمذ حاصل کرنے کے لیے تمھارے سپرد کردیا کہ تم فارغ التحصیل ہوکر نوکری تلاش کروگے، یا چھوکری! شکر ہے، تمھیں بھی پسند آگئی۔ ویسے اگر میری منگنی امیر گھرانے میں نہ ہوچکی ہوتی تو میں تمھیں اس کی بھنک بھی نہ پڑنے دیتا۔

کامی کی منگنی بچپن میں ہی طے کردینے پر ہم نے ان کے والدین کے لیے خصوصی دعا کی۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ اگر ہم نے اسے محنت سے پڑھایا تو تمام تر نتائج کے ذمہ دار خود ہوں گے (شاید اسی لیے وہ ہماری شاگردی میں رہتے ہوئے انٹر نہ کرسکی!) نیز اس کے رشتہ داروں سے خبردار رہیں، کیوں کہ جوڑے بنتے آسمان پر ہیں، مگر توڑے زمین پر جاتے ہیں!

وہ عموماً دیر سے سو کر اٹھتی تھی، بلکہ عام طور پر تو ہمارے جانے پر ہی اٹھتی، اور وقت کی پروا کیے بغیر اطمینان سے ناشتہ کرتی اور چائے کی پیالی تھامے مسکراتے ہوئے پڑھنے چلی آتی۔ اس لیے اس کے انتظار میں مطلق الجھن نہ ہوتی۔ اس قت اس کی آنکھوں کی جو کیفیت ہوتی تھی، وہ صرف سوداؔ کو ہی نہیں، ہمیں بھی اب تک یاد ہے، بلکہ اسی کی مدد سے ہم نے میرؔ کے نیم باز آنکھوں والے شعر کو سمجھا اور آگے چل کر طلبہ و طالبات کو سمجھایا، ورنہ اس سے قبل ہم ایسے اشعار کو اساتذہ کے کلام میں غلو جان کر، انھیں تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے، خود کو نقاد سمجھتے رہے! ہمیں کامی کی اس بات سے پورا پورا اتفاق ہے کہ میرؔ صاحب نے حسن و عشق کے موضوع پر ایسے تمام بلند پایہ اشعار کسی ایسی ہی لڑکی کو ٹیوشن پڑھانے اور فریب کھانے کے بعد کہے ہوں گے! اگر غلطی سے کوئی کتاب بھول آتی تو ہرگز دوبارہ لینے نہ جاتی کہ چھوڑیے آج کچھ اور پڑھ لیتے ہیں۔ اس کی یہ ضد اور بے نیازی بہت بھلی لگتی تھی۔ پھر صورت بھی کم بخت کچھ ایسی تھی کہ سختی کرکے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے کو جی نہ چاہتا تھا۔

کسی سے ذرا مرعوب نہ ہوتی تھی۔ جو کچھ دل میں ہوتا، بلا جھجک منہ پر کہہ دیتی۔ بلا کی شوخ تھی۔ اس کی کوئی بات شرافت و ظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ ہر وقت خود بھی ہنستی رہتی اور دوسروں کو بھی ہنسائے جاتی۔

پڑھاتے ہوئے ابھی کچھ ہی عرصہ ہوا تھا، ایک دن کہنے لگی، ہمارے ہاں روشنائی ختم ہوگئی ہے۔ کل آپ آئیں تو لیتے آیئے گا۔ ابو سے

روز کہتی ہوں، مگر انہیں تو امی کے سوا اور کچھ یاد ہی نہیں رہتا، اور بھائی ڈیل لا کر نہیں دیتے۔ اگلے روز خرید کر لے گئے تو اسی وقت قیمت لا کر میز پر رکھ دی۔ پیسے لینے سے انکار کیا تو بولی:

''آپ کو ملتا کیا ہے، جو آپ ہمیں تحفہ دیں گے۔!''

زور و زر کچھ نہ تھا تو بارے میرؔ

کس بھروسے پہ روشنائی دی!

روشنائی کے بعد ایک بار دستک دی تو خوشی خوشی دوڑتی ہوئی آئی۔ دونوں ہاتھوں، رخسار اور قمیص کے دامن پر آٹا لگا ہوا تھا۔ ہم بے اختیار ہنس پڑے تو دوپٹے سے ہاتھ رگڑتے ہوئے بولی:

''آپ بہت ہی اچھے وقت پر آئے۔ امی نے ناں، مجھ سے آٹا گوندھنے کو کہا۔ ابھی پانی ہی ڈالا تھا کہ آپ آگئے اور میں نے ان سے کہہ دیا اب باقی آٹا آپ خود گوندھ لیں، میں تو سر سے پڑھنے جا رہی ہوں۔ یوں میری جان چھوٹ گئی۔ ویسے امی بے چاری کی قسمت بہت خراب ہے، سوائے ابو کے، اور کچھ ان کے بس میں نہیں۔''

ایک دن پڑھتے ہوئے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اجازت لے کر باہر گئی اور کچھ دیر بعد ہمارے قریب آ کر کان میں آہستہ سے بولی:

''سر! باہر ناں ایک آدمی آیا ہے۔ کم بخت ہے تو بالکل کالا سا، مگر کہہ رہا ہے کہ اپنے ابو سے کہو، لال آیا ہے۔ کہہ دوں...؟''

ایک مرتبہ بارش میں بھیگتے ڈوبتے اندر داخل ہوئے تو فوراً ہیٹر لگایا اور کافی لینے اندر چلی گئی۔ واپس آئی تو ہم نے سردی سے کانپتے ہوئے کہا:

''باہر تو برفانی ہوا چل رہی ہے۔''

پیالی دیتے ہوئے بولی:

''ہاں تو اور کیا دسمبر میں آپ کے لیے لو چلے گی؟''

ایک روز جاتے ہی ہم نے اس سے معاشیات کا سوال سننا شروع کیا۔ اتفاق سے ہم کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے اور ایسے محو ہوئے کہ کچھ خیال ہی نہ رہا۔ اس نے طویل جواب سنانے کے بعد خواب سے بیدار کیا تو ہم نے چونکتے ہوئے کہا:

''میں کچھ سوچ رہا تھا، آپ کا جواب ٹھیک طرح سے سن نہیں سکا۔ دوبارہ سنایئے:

انتہائی معصومیت سے بولی:

''ہاں تو کیا، اب اتنا بور پروگرام دوبارہ ٹیلی کاسٹ کروں!''

انگریزی میں کافی کمزور تھی۔ ایک مرتبہ HEN کو HAN لکھا تو ہم برہم ہو گئے، کہ آپ کو اتنے معمولی لفظ کے ہجے بھی نہیں آتے۔ یہ تو ہم سے پڑھنے والے پرائمری کے بچے بھی جانتے ہیں۔ انتہائی بھول پن سے بولی:

''ہاں تو اُن کے ہاں مرغیاں ہوں گی ناں!''

اسی طرح ایک دفعہ COAT کو COATE لکھ دیا۔ ہم نے توجہ دلائی کہ کوٹ اتنا لمبا نہیں ہوتا۔ ہماری بات کو لاپروائی سے رد کرتے ہوئے بولی:

''جی نہیں، ہمارے ابو کا کوٹ تو اِس سے بھی زیادہ لمبا ہے۔''

''وہ اوورکوٹ ہوگا۔'' ہم نے بے رخی سے جواب دیا۔

''آپ کو یقین نہیں آ رہا، تو لا کر دکھاؤں؟ ویسے لنڈے سے لائے تھے ناں، اس لیے... اور ہاں اوّل تو وہ کوٹ ہے، اوورکوٹ نہیں، اور اگر بقول آپ کے اوورکوٹ ہی ٹھہرا تو بھی غلام عباس مشہور افسانہ نگار جن کا افسانہ ''اوورکوٹ'' اُردو کے چند منتخب افسانوں میں شمار ہوتا ہے کا ہرگز نہیں ہے، میرے ابو کا ہے! (ہاں تو اَب آگے چلیے۔)

''اس کا باپ قریب المرگ ہے''۔ انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لیے یہ جملہ بولا تو قلم میز پر رکھتے ہوئے بولی:

''چہ چہ چہ! کوئی اور جملہ بولیے، گولی ماریں اس کے باپ کو۔ میں ابھی اندر سے ابو کی دونالی بندوق نکال کر لاتی ہوں، ویسے بھی اب وہ بچے گا تو ہے نہیں، کیوں نہ میں ہی اس کا کام تمام کردوں۔

اسی اثنا میں اس کے والد کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے جاتے ہی ہمیں ہاتھ مار کر قہقہہ لگاتے ہوئے بولی:

''میں تو کسی کے باپ کو کہہ رہی تھی، یہاں میرا اپنا ہی باپ آ گیا... گولی ماردوں۔

''انھیں؟ چلو چھوڑو، یہ بے چارے تو پہلے ہی امی کے مارے ہوئے ہیں۔''

ایک صبح کچھ زیادہ دیر سے اٹھی تو ہم سے نہ رہا گیا، اور اسے ڈانٹ ڈپٹ کر وقت پر آنے کی تاکید کرتے ہوئے بغیر پڑھائے ہی چلے آئے۔ اگلے روز پہنچے تو دیکھا، کتابیں اور چائے لیے ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ دیکھتے ہی ادب سے کھڑی ہوگئی:

''آج ناں ہم صبح ہی صبح اٹھ گئے تھے، ابھی نو ہی بجے تھے کہ امی نے ہمیں زبردستی اٹھا دیا... اب تو آپ ہم سے ناراض نہیں ہیں ناں؟''

اب وقت کی اس حد تک پابند ہوگئی تھی کہ کبھی ایک منٹ بھی اِدھر اُدھر نہ ہونے دیتی۔ ایک روز گھڑی کچھ آگے تھی، اس کے حساب سے ساڑھے نو بجے پہنچ گئے۔ والدہ نے اسے اطلاع دی تو بلند آواز میں بولی:

''امی ابھی تو ساڑھے نو بجنے میں پورے تین منٹ باقی ہیں، سر سے کہیے انتظار کریں۔''

لو آپ اپنے دام میں ''استاد'' آ گیا!

کم عقل کہیے یا معصوم، وہ اکلوتی اور لاڈلی ہونے کے سبب خود کو اَب تک بچہ ہی تصور کرتی تھی، اور شاید اس لیے بچکانہ سی حرکتیں بھی کیا کرتی تھی۔ ایک دن پڑھانا شروع کیا تو بولی: ''کل ناں ہم گر گئے تھے، اس لیے آج اپنی ٹانگ میز پر رکھ کر پڑھیں گے۔''

اسی طرح ڈیٹ شیٹ آنے پر ہم نے تنبیہ کی کہ آپ ہر وقت ہنستی رہتی ہیں، اب ذرا سنجیدہ ہو جائیں تو اپنا ہاتھ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے بولی:

''ہم پڑھائی کے دوران بالکل نہیں ہنسیں گے، وعدہ رہا، لایئے ہاتھ ملایئے..... ارے ہاں یاد آیا کل رات فرج میں آپ کے لیے زردہ رکھا تھا، میں ابھی اس پر بالائی ڈال کر لاتی ہوں۔ ہم زردہ کھانے لگے اور وہ چپ چاپ سوالوں کے جواب لکھنے بیٹھ گئی۔ اتنے میں اس کے والد آ گئے اور حیران ہو کر بولے: ''کیوں بیٹے، آج تم لوگ بہت خاموش بیٹھے ہو، کسی کا سوگ منا رہے ہو کیا...؟''

ہم ابھی کوئی جواب دینے بھی نہ پائے تھے کہ انتہائی سنجیدگی سے بولی:

''ابو، اسی لیے تو یہ میٹھے چاول کھا رہے ہیں۔!''

چند ہی روز میں وہ ہم سے کافی بے تکلف ہو گئی اور رفتہ رفتہ اس سے اس قدر لگاؤ پیدا ہو گیا کہ جس روز کسی مجبوری کی بنا پر پڑھانے نہ جا سکتے تو تمام دن ایک ان جانی سی تشنگی کا احساس رہتا۔ وہ بھی شکایت کرتی کہ آپ چھٹی نہ کیا کریں۔ جب پڑھنے پڑھانے کو جی نہ چاہتا (جو اکثر نہیں چاہتا تھا) تو اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت گزارتے، اَنا سے بار بار چائے بنوا کر پیتے رہتے اور بات بے بات قہقہے لگاتے۔ حد درجہ حساس اور ہمدرد تھی۔ اکثر کہا کرتی تھی کہ آپ اکیلے رہتے ہیں، کھانا باہر کھانے کے بجائے ہمارے ہاں کھا لیا کریں۔ جو پیسے وہاں دیتے ہیں وہ ہمیں دے دیا کریں! (مگر کامی نے اجازت نہ دی کہ اگر ابھی کھانا کھا لیا تو بعد میں پھر جھڑکیاں کھاؤ گے۔) خود کبھی بھولے سے کوئی ڈش تیار کرتی تو ہمارا حصہ ضرور رکھ دیتی اور اپنے سامنے کھلا کر ایسی روحانی خوشی محسوس کرتی، جو عام طور سے لوگوں کو یتیموں اور بیواؤں کو کھلا کر ہوا کرتی ہے۔ امتحان میں ایک بار ناکام ہونے کے باعث امتحان کی طرف سے قدرے پریشان ہوتی تو ہم اپنا انٹر کا نتیجہ یاد کر کے (جس میں ہماری کمپارٹ آ گئی تھی) پُرزور پیرائے اور رقت آمیز لہجے میں اس کا حوصلہ بلند کرتے۔

ایک بار محبت کے موضوع پر بات چل نکلی تو ہم نے کہا، چھوڑیں بھئی، محبت تو اُن سے کی جاتی ہے، جن کے پاس کچھ ہو۔ ہم سے تو لوگ روشنائی بھی نہیں لیتے! میز پر ہاتھ مارتے ہوئے زوردار قہقہہ لگا کر کسی قدر شرمندہ ہوتے ہوئے بولی:

''ہاں تو آج آپ کی چوری پکڑی گئی۔ بڑے آئے کہیں سے، مجھے تو کہتے ہیں کہ تم احساسِ کمتری کا شکار ہو...... ہاں تو، جناب خود کس کا شکار ہیں...؟'' (جی میں تو آئی کہ کہہ ہی ڈالیں، مگر کامی کی نصیحت آڑے آ گئی کہ تم اقرار میں پہل ہرگز مت کرنا۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ لڑکے پہل کریں!) ہمیں کامی نے اور اسے اَنا نے روکا ہوا تھا (مگر کامی کا خیال تھا کہ اسے اَنا نے روکا ہوا ہے)۔ البتہ اگر وہ کبھی اپنے بارے میں ہمارے دل کا حال معلوم کرنے کے لیے کوئی بات کرتی تو ہم فراخ دلی سے ظاہر کر دیتے (کامی سے چھپ کر!) لیکن جب ہم اپنے متعلق اس کے دل کی کیفیت جاننا چاہتے تو وہ مرزا غالب کا سا پہلو دار بیان اختیار کرتی، اور ایسا جواب دیتی جس میں مومن کے اشعار سے زیادہ ابہام ہوتا، اور اس سے کوئی اچھی یا بری رائے اخذ کرنا ہمارے دائرۂ عقل سے باہر ہوتا اور ہم پیچ و تاب کھا کر رہ جاتے۔ آخر تنگ آ کر کامی سے ذکر کیا تو انھوں نے ڈانٹا، تم سے ایک لڑکی بھی نہیں سنبھل سکی، حالاں کہ وہ اکثر تمھاری

تعریف کرتی ہے۔ یا تو وہ مجھے جلاتی ہے، یا تمھیں چلاتی ہے۔ یا پھر ہو سکتا ہے کہ وہ تمھارا امتحان لے رہی ہو، جس طرح مومنؔ کے محبوب نے ان کا امتحان لیا تھا جس میں ان کی کمپارٹ آ گئی تھی اور وہ یہ کہہ کر رہ گئے کہ 'میں الزام ان کو دیتا تھا، قصور اپنا نکل آیا۔' ایسا جادو کرو کہ 'اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے۔'

''ارے یار، اب وہ ہمارے پاس تو آنے سے رہی۔ مرزا غالبؔ کے پاس تو ایسے کاموں کے لیے کال کوٹھری تھی۔ آ بھی گئی تو چھپائیں گے کہاں؟''

یہ سنتے ہی انھوں نے اس کے دل کا حال چہرے سے جاننے کی غرض سے اپنی منگیتر کی ایک رنگین تصویر دی، جو ہم نے اگلے ہی روز اسے دکھائی، اور اس کے چہرے کا بغور جائزہ لینے لگے۔ کیا مجال جو کوئی ناگوار تاثر ظاہر ہوا ہو۔ دیکھتے ہی بولی:

''اللہ کتنی بھولی سی لڑکی ہے، اس کی نیلی نیلی آنکھیں تو بہت ہی خوب صورت ہیں۔''

ناچار اپنا سا منہ اور منگیتر کی سی تصویر لے کر رہ گئے۔ شام کو وہ تصویر اسی تعریف کے ساتھ کامی کو لوٹا دی، جس پر انھوں نے اسی وقت نہ صرف کافی پلائی، بلکہ رات کو اسٹیج شو دکھانے بھی لے گئے۔

پھر ایک روز ایسا ہوا کہ اس کے سبق یاد نہ کرنے پر ہم غصے میں اٹھ کر چلے آئے اور اپنا قلم وہاں چھوڑ کر اُس کا قلم اپنے ساتھ لے آئے۔ دوپہر کو بجھے بجھے سے گھر پہنچے اور کچھ کھائے پیے بغیر ہی لیٹ گئے اور ٹک روتے روتے سو گئے۔ شام کو زبردستی اٹھایا گیا تو خود کو شدید بخار میں مبتلا پایا۔ پاؤں رکھنا کہیں چاہتے تھے، پڑتا کہیں تھا۔ غسل خانے کی طرف چلے تو باورچی خانے میں جا پہنچے (کامی جو نفسیات کے طالبِ عالم رہ چکے ہیں، کہتے ہیں یہ بھوک کا لاشعوری ردِعمل تھا، جو ہمیں خود بخود باورچی خانے کی جانب لے گیا)۔ تیسرے روز لڑائی ختم کرنے اور دوبارہ پڑھانے کا فیصلہ کیا، لیکن پھر نہ جانے کیوں راستے میں یہ طے کر لیا کہ اب اسے پڑھائیں گے ہرگز نہیں، بس قلم بدل کر واپس آجائیں گے۔ وہ پہل نہیں کرتی تو ہم بھی نہیں کریں گے۔ وہ لڑکی ہے تو ہم بھی لڑکے ہیں (مگر کامی کہتے ہیں کہ ہم لڑتے ہیں)۔ وہ مغرور ہے تو ہم بھی کوئی گرے پڑے نہیں ہیں (ویسے راستے میں کئی بار گرے تھے)۔ انھی خیالوں میں گم اس کے ہاں پہنچے، دل مضبوط کر کے دروازے پر ہاتھ مارا اور منہ پر وہ رونق پیدا کی، جو اصولاً 'ان کے دیکھے سے آنی چاہیے تھی' تاکہ وہ ہماری حالت بھانپ نہ جائے۔ اتفاق سے اسی نے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھامے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر آنے کا اشارہ کیا۔

''یہ آپ کا قلم میرے ساتھ چلا گیا تھا۔''

''اندر تو آیئے۔''

''ہرگز نہیں۔'' ہم نے پردے سے اندر جھانکا۔

''آئیں نہ بھئی۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' ہم پردہ ہٹا کر اندر آ گئے۔

''صوفے پر بیٹھ جایئے۔ہم ابھی آپ کے لیے........''

''بس میں چلتا ہوں''۔ہم صوفے کی طرف بڑھے۔

''اگر جلدی ہے تو آپ یہ لے لیجیے، ہم اپنے لیے اور بنالاتے ہیں، ابھی صرف ایک ہی گھونٹ پیا ہے۔''

''میں نے چائے چھوڑ دی ہے۔''ہم نے پیالی ہاتھ میں لے لی۔

''آپ بیٹھیں، میں اپنی کتابیں لے کر ابھی آئی۔''

''اب میں کسی کو نہیں پڑھاؤں گا۔''

''ہمیں بھی نہیں؟''

یہ کہتے ہوئے وہ کرسی پر بیٹھنے کے بجائے ہمارے برابر صوفہ پر ہی بیٹھ گئی۔

اس کے چہرے پر نظر پڑی تو دنگ رہ گئے۔ دو دن میں اس کا رنگ بھی سلیٹی ہو چکا تھا۔ابھی اپنی چال کی کامیابی پر ٹھیک سے خوش بھی نہ ہوئے تھے کہ عقدہ کھلا کہ ان کے نانا حضور سے ہماری دو دن کی جدائی بھی برداشت نہ ہو سکی اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ ان کے وصال کا اثر تھا، نہ کہ ہمارے فراق کا! تسلی دی تو آہستہ آہستہ کاجل پھیلنے لگا اور دو موٹے موٹے سے موتی چائے میں آ گرے، جو ہم پی رہے تھے (اور یوں آنسو پینے کی عملی مثال قائم کی)۔ پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

اب بورڈ والوں نے ہم سے بے وفائی کی، اور اپنی سابقہ روایات کو توڑتے ہوئے امتحان وقتِ مقررہ پر شروع کر کے ہماری لگی لگائی روزی ختم کر ڈالی، اور گھر سے دوبارہ وظیفہ جاری کرا دیا۔کئی بار اس سے ملنے کو جی چاہا، مگر کامی کسی طرح آمادہ نہ ہوئے کہ بلاوجہ کسی کے ہاں جانا ٹھیک نہیں ہے، البتہ سالگرہ کے بہانے کچھ لے کر چلے جانا۔ پھر خود ہی کسی طرح اس کی تاریخِ پیدائش معلوم کروائی لیکن بات نہ بنی، کیوں کہ وہ ان چند خوش نصیب لوگوں میں شامل تھی جو، ہر چار سال میں صرف ایک دن پیدا ہوا کرتے ہیں اور...ان کا جنم دن 29 فروری Leap Year میں ہی آتا ہے۔ کامی نے موجودہ سنہ کو کئی مرتبہ چار سے زبردستی پورا پورا تقسیم کرنے کی کوشش کی، کم بخت ہو کے ہی نہ دیا۔کیلکولیٹر کی خدمات حاصل کیں، مگر حاصلِ تقسیم میں پھر بھی کسر رہ گئی۔ آخر کئی کیلنڈر دیکھنے کے بعد ہمت بندھاتے ہوئے بولے:

''دو تین ماہ کی تو بات ہے، نتیجہ آنے پر مل لینا۔نفسیات کی رو سے دور رہنے کی صورت میں دل قریب ہوتے ہیں۔''انھیں یقین تھا کہ اس وقفے میں وہ بھی ضرور کوئی فیصلہ کر لے گی، یا پھر ہو سکتا ہے، اس دوران کوئی ناخوش گوار واقعہ رونما ہو جائے۔ ناچار اٹھتے بیٹھتے اس کے کسی مضمون میں ناکام ہونے، یا ایک اور رشتہ دار کے ہارٹ فیل ہونے کی دعا کرتے رہے، تاکہ پروگرام کا سلسلہ وہیں سے شروع کیا جا سکے جہاں سے منقطع ہوا تھا۔ بدقسمتی سے کوئی ایسا واقعہ ظہور پذیر نہ ہوا اور اس کے بوڑھے بوڑھے رشتہ دار بھی ہمارے خلاف موت کے سامنے ڈٹے رہے۔ اِدھر نتیجہ بھی ملتوی ہوتا چلا گیا اور نکلا بھی تو تقریب بہرِ ملاقات ثابت نہ ہوا یعنی نتیجہ نکلنے سے پہلے

ہی وہ ہمارے ہاتھ سے نکل گئی... اُس کا انتقال ہوگیا!!!!

مہینے کے آخر میں علم کی دولت (ہمارا معاوضہ) اپنی بند مٹھی سے شرماتے ہوئے ہمارے ہاتھ میں اس طرح منتقل کیا کرتی تھی، جیسے تجربہ گاہوں میں گیسیں ایک جار سے دوسرے جار میں ڈالی جاتی ہیں۔ اب بھی جب اپنی تنخواہ کا چیک کاٹتے ہیں تو اکثر وہ ''نرم گرم'' سی مٹھی یاد آجاتی ہے!

میر پور (آزاد کشمیر) 1977ء

پاکستان عالمی سازش کے نرغے میں

طارق اسماعیل ساگر کے چشم کشا مضامین کا مجموعہ...... جن میں پاکستان کو لاحق تمام اندرونی و بیرونی خطرات وسازشوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ 4 اگست 2009 کے موقع پر، پاکستانی نوجوانوں کو باشعور کرنے کی کتاب گھر کی ایک خصوصی کاوش...... درج ذیل مضامین اس کتاب میں شامل ہیں: پاکستان پر دہشت گردوں کا حملہ، 20 ستمبر پاکستان کا نائن الیون بن گیا، دھماکے، وطن کی فکر کر نادان!، پاکستان عالمی سازش کے نرغے میں، حکمتِ عملی یا سازش، طالبان آرہے ہیں؟، محلاتی سازشوں کے شکار، ابھی تو آغاز ہوا ہے!، بلیک واٹر آرمی، اکتوبر سرپرائز اور ''کشمیری دہشت گرد''، سازشی متحرک ہوگئے ہیں!، وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے!، پاکستان کے خلاف ''گریٹ گیم''، جمیت نام تھا جس کا......، آئی ایم ایف کا پھندہ اور لائن آف کامرس، آئی ایس آئی اور ہمارے اربابِ اختیار، ڈاکٹر عافیہ صدیقی کا اغواء، کمانڈو جرنیل بالآخر عوام کے غضب کا شکار ہوگیا، انجامِ گلستاں کیا ہوگا؟، خون آشام بھیڑیے اور بے چارے پاکستانی، عالمی مالیاتی ادارے، چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر!، APDM، سکے جمع کرنے کا شوق، اب کیا ہوگا؟، الیکشن 2008ء اور تلخ زمینی حقائق، کیا ہم واقعی آزاد ہیں؟، آمریت نے پاکستان کو کیا دیا، ہم کس کا ''کھیل'' کھیل رہے ہیں! نئی روایات قائم کیجئے، نیا پنڈورا باکس کھل رہا ہے، قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند!، خوراک کا قحط!، 10 جون سے پہلے کچھ بھی ممکن ہے؟، پہنا گئی درویش کو تاجِ سرِ دارا، کالا باغ ڈیم منصوبے کا خاتمہ، بے نظیر کا خون کب رنگ لائے گا؟، صدر کا مواخذہ، صدر کو اہم مسائل کا سامنا ہے، جناب صدر! پاکستانیوں پر بھی اعتماد کیجئے!، نیا صدر...... نئے چیلنج اور سازشیں، 23 مارچ کا جذبہ کہاں گیا؟، امریکہ، امریکہ کی عسکری اور بھارت کی آبی جارحیت، امریکی عزائم اور ہماری بے بسی، پاکستانی اقتدارِ اعلیٰ کا احترام کیجئے!، امریکہ کی بڑھتی جارحیت، ہماری آنکھیں کب کھلیں گی؟، وقتِ دعا ہے!، امریکی جارحیت کا تسلسل، جارحانہ امریکی یلغار اور بھارتی مداخلت، وزیراعظم کے دورے، عالمی منظر نامہ بدل رہا ہے، باراک اوباما، ممبئی لرز اٹھا، بھارت خود کو امریکہ سمجھ رہا ہے، بھارت سے ہوشیار، مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی نئی لہر

اس کتاب کو پاکستان کی تاریخ اور حالات حاضرہ سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ہم نے ایک اسکول میں پڑھایا

ٹھا تو تھا ولولہ یہ دل میں کہ صرف یادِ خدا کریں گے
معاً مگر یہ خیال آیا، ملی نہ روٹی تو کیا کریں گے

امتحان دے کر اتنی فکر لاحق نہ ہوئی تھی، جتنی پاس کر کے بے روزگاری کے خوف سے ہوئی۔ پڑوس میں ایک صاحب کو مٹھائی کے ذریعے کامیابی کا علم ہوا تو اسی وقت گھر پر تشریف لائے:

''مبارک ہو! بی اے میں سائنس لی تھی، یا آرٹس؟''

''آرٹس!''

''اب اگر ایم اے کرو تو سائنس میں ہی کرنا (پھر کچھ سوچتے ہوئے) تم نے بی اے کیوں کیا؟''

''غلطی ہوگئی، آئندہ نہیں کروں گا!''

''ہی ہی! نویں دسویں کو اُردو تو پڑھا لو گے نا؟''

ہم نے حیرت سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی آمادگی ظاہر کی تو انھوں نے اسی وقت ہم سے ہجے پوچھ پوچھ کر انگریزی زبان میں پرنسپل صاحب کے نام ایک رقعہ لکھا اور پتا سمجھا کر پابندی سے اسکول جانے کی تاکید کی۔ کامی سے ذکر کیا تو انھوں نے اسے ایک نیک شگون قرار دیتے ہوئے ہمارے اچھا ادیب بننے کی پیش گوئی کی (جو بیس سال کا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود، اب تک پوری نہ ہوئی) کیوں کہ بقول ان کے اکثر ادیبوں اور شاعروں نے یا تو چھوٹی موٹی سرکاری ملازمتیں اختیار کر کے اپنے بچوں کا، یا پھر درس و تدریس سے منسلک رہ کر دوسروں کے بچوں کا مستقبل برباد کیا ہے! بہر حال اگلے ہی روز ان کا دیا ہوا رقعہ اور بڑے بھائی سے لیا ہوا سوٹ پہن کر وقتِ مقررہ سے کچھ پہلے ہی اسکول پہنچ گئے (ہمارے والدین سے روایت ہے کہ اپنے لڑکپن میں ہم نے ایسی فاش غلطی کبھی نہیں کی)۔

بعد میں اندازہ ہوا کہ سوٹ مانگنا اس بات کی دلیل تھی کہ ہم استاد بننے جا رہے تھے، کیوں کہ ہمارے ہاں اس پیشے سے وابستہ لوگوں کو جو مشاہرہ ملتا ہے، اس میں وہ اپنا تن خریدے ہوئے کپڑوں سے ہرگز نہیں ڈھانپ سکتے اور جس کے پاس پہننے کو کپڑے نہ ہوں، معاشرے میں اس کے جملہ حقوق کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں! کامی تو یہاں تک کہتے تھے کہ اسکول ماسٹر اپنے ملک کے لیے بھی صرف تن من کی

بازی ہی لگا سکتا ہے کیوں کہ دھن تو اس بے چارے کے پاس ہوتا ہی نہیں!

ہمیں اپنی طرف آتا دیکھ کر پرنسپل صاحب نے سگریٹ سلگائی، اندر داخل ہوئے تو بڑی عاجزی سے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دھوئیں سے جگہ کی نشان دہی کی، نیز کئی بار نام اور ولدیت پوچھنے کے بعد انتہائی مشکوک انداز میں اُردو زبان و ادب سے وابستگی جاننے کی غرض سے کچھ بے تکے سوالات کیے مثلاً، علامہ غالبؔ اور مرزا اقبالؔ کون تھے؟ پریم چند کی انشائیہ نگاری کے بارے میں ناقدین کی کیا رائے ہے؟ آزاد نظموں اور نثر کا شمار الگ الگ اصنافِ سخن میں کیوں کیا جاتا ہے، جب کہ دونوں میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہنے لگے:

''بیٹا آپ کی طرح مجھے بھی ادب سے گہرا لگاؤ ہے، غالبیات اور اقبالیات ایم اے میں متواتر کئی سال میرا پسندیدہ موضوع رہا، گو اِن موضوعات پر عبور حاصل ہونے کے باوجود میں نے یونی ورسٹی سے سند لینا گوارا نہ کی، مگر غالبؔ کا وہ مصرع آج تک میرے ذہن پر بالترتیب نقش ہے اور سچ پوچھیے تو یہی آٹھ لفظی مصرع میری ساٹھ سالہ زندگی کی اساس ہے اور میری تمام تر کامیابیاں اسی کی مرہونِ منت ہیں، ''شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا!''

''اس عمر میں صاحب کا ایسا حافظہ اور مطالعہ واقعی قابلِ قدر ہے۔'' وائس پرنسپل صاحب نے مداخلت کی۔

''خی خی (پرنسپل صاحب ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے) بیٹا، اب تو ان نوجوانوں کے دن ہیں، ہمارا حافظہ اور مطالعہ کہاں رہا بقول اقبالؔ، مضمحل ہوگئے قویٰ غالبؔ!''

''ادب سے اس قدر گہرا ربط ہونے کے باوجود صاحب نے اب تک کوئی کتاب تصنیف نہ کر کے اُردو زبان پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔'' وائس پرنسپل صاحب نے اپنی ملازمت مزید پکی کرتے ہوئے بے ربط تعریف کی۔

''بیٹا! غالبؔ کے اُردو کلام پر فارسی زبان میں اور اقبالؔ کے فارسی کلام پر اُردو زبان میں بالترتیب دو سیر حاصل مقالے شروع کیے تھے، مگر وہ مکمل نہ ہو سکے، کیوں کہ اپنے گہرے مطالعے اور وسیع تر علمی معلومات کی بنا پر میں نے مختلف نقادوں کے اتنے حوالے دیے کہ مجھے ان پر مقالات کے بجائے ''حوالات'' کا گمان ہونے لگا اور میرا ذہن اس میں قید ہو کر رہ گیا، پھر موضوع بھی قابو سے باہر ہو گیا اور اس افراتفری کے عالم میں یہ یاد ہی نہ رہا کہ میں بالترتیب کیا کہنا چاہتا تھا۔ بعد میں وقت ہی نہ ملا۔ (سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے) بیٹا! آپ نے قاتل خنجر آبادی کا نام تو سنا ہوگا، میں شاعری میں انھی کا فارغ الاصلاح ہوں (آہ بھرتے ہوئے) وہ بھی کیا زمانہ تھا، جوانی میں شعروں کی آمدیں ہوتی تھی، جیسے بڑھاپے میں بیماریوں کی، مثلاً ایک رات پانی پینے کے لیے اٹھا تو باورچی خانے میں ہی آمد شروع ہوگئی۔ میں نے اسی وقت قلم کھول کر ایک طویل نظم ''پیلے کانچ کا واٹر سیٹ'' قلم بند کر ڈالی اور منٹوں میں پورا واٹر سیٹ مکمل کر لیا۔ طویل اس لیے ہوگئی کہ ایک تو یہ آزاد تھی اور دوسرے اس میں ایک جگ اور چھ گلاس تھے، اور ہر گلاس پر میرے تین تین بند تھے، جگ کی تعریف علاحدہ تھی۔ (چائے کی پیالی ہماری طرف بڑھاتے ہوئے) بیٹا، دراصل یہ واٹر سیٹ میں نے ایک نمائش

میں رکھا دیکھا تھا، مگر خریدنے کی استطاعت نہ ہوئی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ شاعر بے حد مفلس اور حساس ہوتا ہے، اس لیے یہ سیٹ مسلسل میرے دل ودماغ میں اور اہلیہ گھر میں ہلچل مچا رہی تھیں۔ یوں میں نے اس نظم کی شکل میں اپنا سرمایہ اور ازدواجی زندگی محفوظ کرلی۔ یہی وجہ ہے کہ میری اس نظم میں میؔر کا سا سوز وگداز اور تغزل پایا جاتا ہے۔ یہ میری آخری نظم تھی، جس کی تخلیق کے فوراً بعد میں نے (اپنے حال اور) جدید شاعری کے مستقبل سے مایوس ہوکر تمام تر ادبی سرگرمیاں معطل کردیں۔ (چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے) بیٹا! فارسی زبان سے بھی کبھی لگاؤ رہا ہے آپ کو؟''

''جی ہاں، بی اے میں بہ حیثیت اضافی مضمون کے، جس کی بدولت نمبروں میں خاصا اضافہ ہوا۔''

''خی خی خی!''

(یہ ان کا تکیہ کلام تھا۔ ہر کس وناکس کو عمر وجنس اور رشتے کا خیال کیے بغیر بالترتیب بیٹا ہی کہتے تھے)۔

پرنسپل صاحب آٹھویں جماعت کا انچارج بنانے کے بعد، پہلے دسویں جماعت میں لے گئے، جہاں سب سے زیادہ شریر لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ رسمی سا تعارف کرانے کے بعد وہ خود تو باہر نکل گئے اور ہمیں ان کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ چوں کہ اس سے قبل کبھی کسی اسکول میں پڑھانے کا اتفاق نہ ہوا تھا، اس لیے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ آغاز کیسے کریں۔ ابھی ٹھیک سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ہلکی ہلکی سی آوازیں آنا شروع ہوئیں:

''اِن کی مونچھیں ہٹلر سے کتنی ملتی ہیں!''

''یہ جرمنی میں رہے ہوں گے۔''

''جرمنی میں رہے ہوتے تو یہاں کیوں جھک مارتے؟''

''نہیں، ان کے آباؤ اجداد دوسری جنگِ عظیم کے دوران ہجرت کر کے ہندوستان آگئے ہوں گے، پتا ہے ہماری اُردو کی کتاب میں بھی کئی لوگوں کے متعلق یہی لکھا ہوا ہے۔''

''اچھا تو یہ اُردو پڑھائیں گے!''

''شکل سے تو نہیں لگتا۔''

''ویسے آسان سا مضمون ہے، شاید خلاصوں کی مدد سے پڑھالیں۔''

''ہوسکتا ہے یہ بہت قابل ہوں۔''

''قابل ہوتے تو پڑھ لکھ کر دوبارہ اسکول میں داخل نہ ہوتے!''

''یہ اتنے دبلے کیوں ہیں؟''

''کافی عرصہ سے بے روزگار معلوم ہوتے ہیں۔''

''شاید اب ان کے دن پھر جائیں۔''

''پگلی، اسکول ماسٹر کے دن کبھی نہیں پھرتے، البتہ یہ خود دن بھر پھرتے رہتے ہیں۔کبھی ٹیوشن کی تلاش میں اور کبھی اچھے روزگار کی آس میں! سب کچھ سننے کے بعد ہم نے ڈرتے ڈرتے کتاب مانگی اور اسے کھول کر گھبراہٹ میں پورا ایک صفحہ پڑھ ڈالا۔ورق پلٹنے لگے تو آواز آئی:

''یہ پڑھنے آئے ہیں، یا پڑھانے؟''

یہ سنتے ہی کتاب بند کی اور بلاوجہ لڑکیوں سمیت سب کے نام پوچھنا شروع کردیے۔دس منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ یہ کام بھی تمام ہوا۔سوچا اب کیا کریں۔دوبارہ کتاب کھولی اور غالبؔ کی ایک غزل پڑھانے کا ارادہ کیا۔پہلے ہی مصرعے پر اس قدر داد ملی کہ شاید مرزا کو اپنے پورے کلام پر بھی نہ ملی ہوگی۔ایسی بے خودی سی طاری ہوئی کہ خوشی میں شعر کا مطلب ہی ذہن سے محو ہوگیا، لیکن مکرّر مکرّر کی آوازیں برابر آرہی تھیں، اس لیے انھیں غنیمت جانتے ہوئے وہی مصرع بار بار پڑھا اور مزید داد حاصل کی۔وہ لوگ شاید ابھی اچھی طرح محظوظ بھی نہ ہو پائے ہوں گے کہ ہم محفوظ ہوگئے یعنی پیریڈ ختم ہوگیا۔اطمینان کا سانس لیا اور اُردو کی کتاب جو غالباً کسی لڑکی نے دی تھی، مطالعے کے لیے ساتھ لے جانے کو مانگی تو وہ لپک کر ہمارے ہاتھ سے کتاب چھینتے ہوئے بولی، ''سر مجھ پر رحم کریں۔ابھی کچھ دن پہلے بھی ایک اور صاحب اسی طرح میری فزکس اور کیمسٹری کی کتابیں لے جاچکے ہیں، مگر تقریبِ رونمائی کے بعد ان کا دوبارہ دیدار نصیب نہ ہوا۔اپنا سارا نصاب ایک ایک کر کے نئے ٹیچرز کو دیتی رہی تو میں نے میٹرک کرلیا!''

پرنسپل صاحب کی نااہل سی اہلیہ بھی اسکول انتظامیہ کا حصہ تھیں، جو انھیں چلانے کے ساتھ ساتھ اسکول کی کینٹین بھی چلاتی تھیں۔اسکول کے صدر دروازے پر کبھی کوئی بھولا بھٹکا چھابڑی والا آنکلتا تو یہ بچوں کو زبردستی دھکے دلوا کر اندر بلوا لیتیں اور گیٹ بند کرا دیتیں کہ جب ملک خوراک کے معاملے میں خودکفیل ہے تو پھر باہر سے اشیا درآمد کرکے قیمتی زرِ مبادلہ ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے! پرنسپل صاحب بھی اس سلسلے میں ان کی بڑی مدد کیا کرتے تھے اور اسمگلنگ کی روک تھام کے لیے انھوں نے ایک علاحدہ چوکی دار رکھا ہوا تھا، جسے تمام بچے کسٹم آفیسر کہا کرتے تھے، کیوں کہ وہ بچوں کی درآمد کردہ اشیا پر اپنی لگائی ہوئی ڈیوٹی وصول کرلیا کرتا تھا! چوں کہ عقل کم اور آمدنی زیادہ تھی، اس لیے مادام نے کینٹین کا حساب کتاب رکھنے کے لیے اپنے بیٹے کے ذریعے خزانچی کی اسامی پُر کی ہوئی تھی، جو لین دین میں واقعی بہت پکا تھا اور مادام کے سائے تلے 75/ پیسے اور ایک روپے کا میزان عموماً سوا روپیہ لکھتا تھا۔اس کے علاوہ مادام اسکول اسٹاف پر بھی کڑی نظر رکھتی تھیں اور وقتاً فوقتاً انھیں ہدایات جاری کرتی رہتی تھیں۔کسی بھی استاد کی ملازمت کا دارومدار اُن کی تیار کردہ خفیہ رپورٹ پر ہوتا تھا، جو ایم سی آر (Madam's Confidential Report) کہلاتی تھی۔

اس کے علاوہ چند خالی نشستوں پر داخلے سارا سال جاری رہتے تھے، جو عام طور پر کسی بچے کی آمد کی خبر ملتے ہی پُر ہوجاتی تھیں، البتہ donation کے نام پر والدین کی جیب خالی کرانے پر یہ مخصوص نشستیں دوبارہ بحال ہوجایا کرتی تھیں۔داخلہ ہوتے ہی بچے کے

ہاتھ میں ایک لمبی سی فہرست دے دی جاتی تھی، جس میں شامل اشیا بھی اسکول سے خریدنا ضروری ہوتا تھا (واضح رہے یہ چیزیں نصابی کتب کے علاوہ ہوتی تھیں)۔ اکثر اوقات فہرست دیکھ کر ماں کو Maternity Home کا اور مالی امداد کر کے باپ کو Charity Home کا گمان ہوتا تھا اور انھیں یقین ہی نہ آتا تھا کہ انھوں نے اپنے لختِ جگر کو کسی اعلیٰ انگریزی اسکول میں داخل کیا ہے۔

ہمیں ملازمت ملنے کے بعد سے کامی برابر پیچھے پڑے ہوئے تھے کہ اسکولوں سے ٹیچر نکلتے رہتے ہیں اور امتحانوں میں لگا تار فیل ہونے کی بنا پر انھیں بھی پڑھنے کا کافی تجربہ ہے، جب بھی کوئی ٹیچر نکلے تو انھیں ضرور مطلع کیا جائے۔ اسی اثنا میں نئے سال کا بجٹ آنے پر حکومت نے نجی اداروں کو اپنے ملازمین کی تنخواہ میں فی ملازم پچاس روپے ماہانہ کا اضافہ کرنے کی تاکید کی تو اسکول انتظامیہ نے اس ضمن میں تحریری ہدایات ملتے ہی پچاس روپے فی بچہ کے حساب سے فیس بڑھا دی۔ اسلامیات کے ٹیچر نے بچوں کی تعداد کو پچاس سے ضرب دینے کے بعد حاصلِ ضرب کو اساتذہ کی کل تعداد سے تقسیم کر کے خوش خبری سنائی کہ تنخواہ میں فی استاد 2307 روپے ماہانہ کا اضافہ متوقع ہے (جو اُن کو اس وقت ملنے والی تنخواہ کا 922 فی صد بنتا تھا)۔ انھوں نے ایک میٹنگ کے دوران انتظامیہ کو اپنے لگائے ہوئے اعداد و شمار سے آگاہ کرتے ہوئے مجوزہ اضافے کا مطالبہ کیا تو انھیں اگلے ہی روز اپنے مضمون سے تغافل برتنے اور اکاؤنٹینٹ کے کام میں دخل اندازی کرنے کے دوہرے جرم میں اسٹاف کی کل تعداد سے منفی کر دیا گیا اور اس طرح اسکول میں کامی کے لیے اسامی خالی ہوگئی۔ بات کی تو پرنسپل صاحب نے اگلے ہی روز انھیں انٹرویو کے لیے طلب کر لیا۔ جب کامی نے انھیں بتایا کہ وہ کیمیا، طبعیات، الجبرا، جیومیٹری، فزیالوجی، ہائی جین، اُردو، انگریزی، اسلامیات، معاشرتی علوم، ریاضی، ڈرائنگ اور جنرل سائنس کے سوا باقی تمام مضامین بخوبی پڑھا سکتے ہیں تو پرنسپل صاحب نے انھیں زراعت و باغبانی پڑھانے کے لیے رکھ لیا۔ کامی غصہ ہوگئے کہ وہ مالی ہرگز نہیں بنیں گے۔ جب انھیں بتایا گیا یہ ایک اختیاری مضمون ہے تو انھوں نے معذرت کر لی کہ یہ ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ پاس بیٹھے ہوئے اسٹاف ممبران نے سمجھایا کہ جس طرح وزیر بننے کے لیے پڑھا لکھا ہونے کی قید نہیں، صرف الیکشن جیتنا شرط ہے، اسی طرح اسکول ٹیچر کے لیے بھی اپنے مضمون پر عبور حاصل ہونا ضروری نہیں، صرف تعلیم یافتہ بے روزگار ہونا کافی ہے اور ہدایت کی کہ ان کی طرح وہ بھی آسان اسباق پڑھا دیا کریں اور مشکل اسباق امتحان میں دے دیا کریں تو کامی تیار ہوگئے۔

پرنسپل صاحب نے ان کی درخواست کو غور سے پڑھا تو کہنے لگے:

''بیٹا! اسے مسترد کرتے ہوئے آپ کا بحیثیت سینئر ٹیچر تقرر کیا جاتا ہے۔''

کامی نے گھبرا کر وجہ دریافت کی تو بولے: ''آپ نے اپنی درخواست میں مجھے پرنسپل صاحب کی بجائے ہیڈ ماسٹر صاحب لکھ کر مخاطب کیا ہے۔''

کامی نے یہ سنتے ہی معذرت کی تو فوراً اپنے سامنے رکھی ہوئی انگوروں کی پلیٹ ان کی طرف بڑھائی۔ کامی نے ایک دانہ منہ میں رکھا تو ان کی دونوں آنکھیں بند ہوگئیں۔ پرنسپل صاحب کچھ شرمندہ سے ہوگئے:

''بیٹا! منہ نہ بنائیے، یہ تو بہشتی پھل ہے (پھر پلیٹ کو ہماری طرف کرتے ہوئے) بیٹا، اس پھل کی مذہبی حیثیت سے متاثر ہو کر میں نے اس پر بھی اپنی مشہور آزاد نظم، ''انگور کی بیل پر لنگور کی ریل'' قلم بند کی تھی، جس کی شاخیں حد سے تجاوز کر گئیں اور اپنی طوالت کے سبب وہ آج تک شائع نہ ہو سکی (پھر منہ سے جھاگ نکالتے ہوئے) بہر حال اس سے اس کی عظمت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

پرنسپل صاحب غالب کے برخلاف ستائش اور صلے کی تمنا رکھتے تھے (بقول کامی مرزا نے تو روایت سے بغاوت کی تھی، انھوں نے مرزا سے بغاوت کر دی)۔ ایک دن پتا نہیں کس ترنگ میں آ کر ایک لیڈی ٹیچر کی تنخواہ میں مبلغ پچیس روپے کا اضافہ کر دیا، جو محترمہ نے چپ چاپ اپنے پرس میں رکھ لیے۔ انھیں میڈم کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری، اس وقت تو کچھ نہ کہا، مگر اگلی صبح اسمبلی میں سب کے سامنے رونی صورت بناتے ہوئے بولے:

''بیٹا! بڑے افسوس کا مقام ہے، میں نے خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے (جذبات میں آ کر) تنخواہ میں دس فی صد کا اضافہ کیا، لیکن آپ نے مجھے تھینک یو تک کہنا گوارا نہ کیا۔''

اسی طرح ایک روز کسی کام سے اپنی اہلیہ کے ہمراہ آٹھویں جماعت میں آئے تو کوئی کھڑا نہ ہوا، بلکہ جن بچوں کو سزا کے طور پر کھڑا کیا ہوا تھا، وہ بھی انھیں دیکھ کر سہمے ہوئے سے اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہم نے بھی کوئی خاص توجہ نہ دی تو جل کر بولے:

''آپ لوگ کھڑے کیوں نہیں ہوئے، میڈم کا نہیں تو کم از کم میرے ہی بلند مرتبے کا خیال کیا ہوتا۔''

اسٹاف کی ہر حرکت پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ ہم چھٹی کی درخواست دیتے وقت وجہ کے طور پر یوں ہی کسی نام نہاد کزن کا حوالہ دے دیا کرتے تھے مثلاً، کبھی کسی کزن کو بیرونِ ملک ملازمت دلا کر اسے الوداع کہنے ایئر پورٹ چلے گئے، کبھی کسی کزن کی شادی کا بہانہ کر کے انتظامات میں مشغول ہو گئے، کبھی کسی کو اسپتال پہنچا کر اُس کی تیمار داری شروع کر دی، وغیرہ وغیرہ۔ الغرض یوں ایک ہی سال میں سوچے سمجھے بغیر نا جانے کتنی چھٹیاں کر ڈالیں۔ اتفاق سے ایک روز دوستوں کے ساتھ پکنک پر جانے کا پروگرام بن گیا اور اسکول نہ جا سکے۔ اگلے روز حسبِ سابق ایک درخواست لکھی، جس کا نفسِ مضمون کچھ یوں تھا کہ ہماری ایک کزن کے ہاں بچہ پیدا ہوا تھا اور اس کی حالت نازک ہے (بچہ البتہ خطرے سے، بلکہ اسپتال سے بھی باہر تھا کیوں کہ وہ مر چکا تھا) جس کے باعث اسکول نہ آ سکے۔ درخواست کو منظور کرتے ہوئے اکاؤنٹینٹ صاحب کو مخاطب کر کے انتہائی حیرت سے بولے:

"Mr. Alvi never told me that he has more than twenty cousins."

ملازمت ملنے کے چند ہی روز بعد کامی نے اشارے سے باتھ روم میں بلایا اور ایک لمبی جمائی لیتے ہوئے انتہائی راز داری سے بتایا کہ انھوں نے اسکول میں اپنے قدم پوری طرح جما لیے ہیں اور طلبہ و طالبات کو اپنی مٹھی میں لے لیا ہے، جو اُن کے ایک اشارے پر کلاسوں کا بائیکاٹ کر سکتے ہیں۔ اب انھیں اسکول سے کوئی نہیں نکال سکتا، حتیٰ کہ ایم سی آر بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، اس لیے وہ خوب من مانی کریں گے (پرائیویٹ سروس میں رہتے ہوئے سرکاری ملازمت کا مزہ لوٹیں گے)۔ چناں چہ انھوں نے خود کو

طالب علم سمجھتے ہوئے اسکول سے بلا اطلاع غیر حاضر رہنا شروع کر دیا۔ اسی زعم میں مبتلا ایک روز کھانے کے وقفے میں دفتر آئے اور آدھے دن کی چھٹی مانگی۔ پرنسپل صاحب نے (جو کچھ دو اور کچھ لو کے عقیدے کے علم بردار تھے) حسبِ معمول رسیدی ٹکٹوں کے پیسے طلب کیے اور ساڑھے تیرہ دن کی تنخواہ ہاتھ پر رکھتے ہوئے پوری چھٹی دے دی۔ بقول ان کے اس روز کامی نے آٹھ کے بجائے بالترتیب چار ہی پیریڈ لیے تھے اور سترہ دن کی ملازمت کے آخری عشرے میں ان کی تین چھٹیاں بھی شامل تھیں۔ کامی ان کا اور ہم کامی کا منھ تکتے رہ گئے۔

اور اب چند ذہین اور حاضر جواب طلبہ و طالبات کے واقعات جو عرصۂ دراز گزرنے کے باوجود بھی بالکل تازہ معلوم ہوتے ہیں اور جن کا ذکر کیے بغیر عنوان کچھ نامکمل سا رہے گا:

آٹھویں جماعت میں ایک صولت نامی لڑکی ہوا کرتی تھی، جو اچھی نعت خواں ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی سادہ اور تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے شوخ تھی۔ گرامر کا پیریڈ تھا۔ اس سے اسمِ صوت کی تعریف پوچھی تو نظریں جھکا کر شرماتے ہوئے بولی:

''سر اسمِ صوت وہ اسم ہے جس میں ناں..... جس میں ناں، لام ہٹا کر میری آواز کی تعریف کی جائے!''

دسویں جماعت میں ایک ہارون نامی لڑکا ہوا کرتا تھا جو انتہائی شریر تھا، مگر ہماری بہت عزت کرتا تھا۔ جماعت میں ہم سے زیادہ اسی کا رعب تھا۔ نیز اسکول میں حقوقِ نسواں کا محافظ بھی انتظامیہ سے زیادہ وہی تھا۔ کوئی لڑکی اسے ہارون بھائی کہتی تھی تو کوئی قارون بھائی۔ ایک روز سبق یاد نہ کرنے پر اسے کھڑا کیا اور مارنے لگے تو ہماری عمر پوچھنے کے بعد ڈنڈا اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے بولا:

''سر آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ میں آپ سے پورے تین سال بڑا ہوں، اس لیے بلحاظ بزرگی آپ پر میری تعظیم فرض ہے، نہ کہ تعلیم!'' اسے بس میں سفر کے دوران رعایتی ٹکٹ طلب کرنے پر بھی کافی دقت اور خفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا، کیوں کہ اکثر کنڈیکٹر ٹکٹ دینے سے پہلے، کارڈ دیکھنے کے باوجود بھی، اس کے طالب علم ہونے پر شک (اور بزرگ رشک) کیا کرتے تھے۔ ایک دن پرنسپل صاحب طالب علموں سے ان کے مسائل معلوم کرنے کی غرض سے وائس پرنسپل کو ساتھ لیے دسویں جماعت میں آئے تو ایک لڑکی نے بیت الخلا میں لوٹے کی عدم موجودگی کی شکایت کی۔ پرنسپل صاحب ابھی کچھ کہنے ہی والے تھے کہ ہارون بولا:

''بیٹھ جائیے، پانی آجانے پر لوٹا بھی رکھ دیا جائے گا!'' یہ جواب سن کر سب بے اختیار ہنس پڑے اور پرنسپل صاحب اپنے مسوڑھے پیس کر رہ گئے۔ آس پاس کوئی کھمبا تو تھا نہیں، اس لیے ایک بچے کا منھ نوچ لیا، جو شامت کا مارا اسی وقت کسی مہمان کی آمد کی اطلاع دینے کی غرض سے اندر داخل ہوا تھا۔

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے! ہمارے خیال میں اگر اس قسم کا فضول سوال آج کے دور میں کیا جاتا تو اسمبلیوں کے حوالے سے اس کا جواب بہ آسانی دیا جاسکتا تھا!

نویں جماعت میں تین سہیلیاں نیر، نیلم اور گل ہوا کرتی تھیں، جو ہر وقت سائے کی طرح ایک ساتھ رہتی تھیں۔ امیر گھرانوں

سے تعلق تھا، اس لیے جماعت کے بجائے کیفے ٹیریا میں زیادہ پائی جاتی تھیں۔ پھر بھی پڑھنے اور لڑنے میں سب لڑکیوں سے آگے تھیں۔

ایک روز سخت سردی کے باعث باہر دھوپ میں پڑھانے کا پروگرام بنایا۔ سب لوگ گھاس پر اپنی اپنی جگہ صاف کر کے بیٹھ گئے اور یہ تینوں یوں ہی زمین پر بیٹھ گئیں۔ ہم سے نہ رہا گیا اور انھیں ٹوکا کہ کتا بھی بیٹھنے سے پہلے اپنی دم سے جگہ کو صاف کر لیتا ہے اور آپ تینوں......نیلم جھٹ ہماری بات کاٹتے ہوئے بولی:

''ہم کوئی دم دار کتا تھوڑا ہی ہیں، البتہ یہ جو دوسرے لوگ ہیں ناں، یہ روز کرسی پر بیٹھنے سے پہلے بھی کتے والی حرکت ضرور دُہراتے ہیں!''

ایک دن برائن نے (جس سے پرنسپل صاحب بھی پناہ مانگتے تھے) تنخواہ کے بارے میں سوال کیا تو ہم نے وقت گزاری کا بہانہ کر کے ٹال دیا (ویسے تنخواہ بھی بتانے والی نہیں تھی)۔ وہ پھر بھی بضد رہا:

''بتائیں تو سہی گزارا الاؤنس کیا ملتا ہے؟'' تنخواہ بتائی تو قہقہہ لگاتے ہوئے بولا: ''سر ساڑھے تین سو روپے تو ہم اپنے مالی کو دیتے ہیں، جو روزانہ صرف ایک گھنٹا ڈیوٹی دیتا ہے۔'' نیر ہمیں شرمندہ سا دیکھ کر برجستہ بولی:

''برائن کیا خیال ہے، سو روپے زیادہ حاصل کرنے کی خاطر سر تمھارے مالی بن جائیں؟''

اسی طرح ایک روز برائن سے مومنؔ کے ایک شعر کا مطلب پوچھا تو اس نے صاف جواب دے دیا کہ وہ اس کی تشریح نہیں کر سکتا۔ ہم نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ذہن پر ذرا زور ڈالنے کو کہا تو پیچھے سے گل بولی:

''سر کم زور چیز پر زیادہ زور نہ ڈلوائیں۔'' وہ بے چارہ شرمندہ ہو کر بیٹھ رہا۔

نویں جماعت میں ہی ایک سائرہ نامی غیر مسلم لڑکی پڑھا کرتی تھی۔ بلا کی حسین تھی، مگر ایک ٹانگ میں کچھ خرابی ہونے کے باعث لڑکے بھی اسے دیکھنے سے معذور تھے، اس لیے کسی قدر احساسِ کمتری کا شکار تھی اور اکثر خالی پیریڈ میں کلاس روم میں بیٹھی ہم سے باتیں کر کے ہمیں ایمان میں مبتلا کیے رکھتی (کامی کو دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ تو احساسِ کمتری کا شکار ہے، ہم اس کا شکار نہ ہو جائیں)۔ بہر حال یہ لڑکی اپنی سادگی اور بھولپن کے سبب، چاہے جانے کے قابل تھی۔ ایک روز ''خطوطِ غالب'' پڑھا رہے تھے، نیلم سے پڑھنے کو کہا تو اُس نے اصل سطور چھوڑ کر اگلا پیراگراف پڑھنا شروع کر دیا، جو یہاں سے شروع ہوتا تھا:

''چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے جو کنواں تھا......''

برائن نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا:

''نیلم! تم تو ایک دم ہی چوک پر پہنچ گئیں۔'' پوری جماعت ہنسنے لگی اور وہ شرما کر بیٹھ گئی۔ اب نیر سے پڑھنے کو کہا، وہ بھی باتوں میں مشغول تھی، اس لیے اس نے گھبراہٹ میں اور بھی آگے سے پڑھنا شروع کر دیا۔ ہم نے اس سے پوچھا:

''یہ آپ کہاں پہنچ گئیں؟'' تو قریب بیٹھی ہوئی سائرہ بولی:

''سر یہ چوک سے بھی آگے نکل گئیں!''

اسی جماعت میں ایک موٹی سی لڑکی پڑھا کرتی تھی، جتنی خوب صورت تھی، اتنی ہی شریر بھی تھی۔ ٹیچرز اس سے سخت پریشان تھے۔ یہ سب کو بہت تنگ کیا کرتی تھی۔ جب بھی کوئی استاد کچھ لکھنے کے لیے تختۂ سیاہ کا رخ کرتا، یہ پیچھے سے چاک مارتی۔ نازک مزاج اور حساس تھی۔ بات بات پر ناراض ہو جاتی تھی، اس لیے تمام ہم جماعت اسے چھوئی موئی کہتے تھے، ورنہ اصل نام شاید لبنیٰ تھا۔ حاضر جوابی میں بھی اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ایک بار میرؔ کی غزل پڑھا رہے تھے۔ سائرہ کہنے لگی:

''سر آپ غزل پڑھاتے وقت صرف لڑکوں سے مخاطب ہوتے ہیں، ہماری طرف تو متوجہ ہی نہیں ہوتے۔''

یہ چھوٹتے ہی بولی:

''اور کیا سر تمھیں مخاطب کر کے کہیں، میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے!''

ایک روز دسویں جماعت میں مولانا محمد حسین آزاد کا مضمون ''سیّد انشا کا انجام'' پڑھا رہے تھے۔ اس میں ایک جملہ کچھ یوں تھا ''جم جم آئیے، نت نت آئیے۔'' ہم معانی لکھنے کے لیے بورڈ کی طرف بڑھے تو ارشد (جو اسکول کے انتہائی بدتمیز اور چند نالائقوں میں سے ایک تھا) کہنے لگا: ''سر ٹھہریے، میں ان الفاظ کے معانی بتاتا ہوں۔'' ہم نے چاک میز پر رکھ دیا تو انتہائی سنجیدگی سے بولا ''جم جم آئیے کا مطلب ہے، جمتے جاؤ اور آتے جاؤ۔''

(جمنا، پنجابی، بمعنی پیدا ہونا، دریائے جمنا نہیں۔)

کامی کے نکالے جانے کے بعد پرنسپل صاحب سے ہمارے تعلقات دوستوں کے بجائے اپنوں کے سے ہو گئے تھے۔ مہینہ ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے کہ اسی دوران ایک دن چپراسی ان کا نکالا ہوا آفس آرڈر لے کر آیا۔ ہم نے اسے پڑھا اور دستخط کیے بغیر ہی واپس کر دیا۔ پرنسپل صاحب نے ہمارے انکار کو اپنی شکست اور بے عزتی پر محمول کرتے ہوئے اسی وقت بلا بھیجا اور وجہ دریافت کی تو ہم نے صاف صاف بتا دیا کہ اتنی کم تنخواہ میں خوامخواہ ٹرانسپورٹ انچارج کی اضافی ذمہ داری نہیں سنبھال سکتے۔ یہ کہہ کر واپس جماعت میں آ گئے تو انھوں نے اس سلسلے میں اکاؤنٹینٹ صاحب سے رابطہ قائم کیا اور ان سے دباؤ ڈالنے کو کہا۔ اکاؤنٹینٹ صاحب کا نام غیر مسلم ہونے کے باوجود خالص اسلامی یعنی عتیق الرحمٰن تھا، اس لیے اسکول کے بچے انھیں نام کا مسلمان کہتے تھے۔ وہ سرکاری ملازمت میں بحیثیت سینئر کلرک ریٹائر ہونے کے بعد ترقی کرتے کرتے یہاں اکاؤنٹینٹ بن گئے تھے۔ چھٹی کے بعد دفتر سے نکل رہے تھے کہ رحمٰن صاحب مل گئے اور چائے پلانے کی پیش کش کی۔ تھکے ہوئے تو تھے ہی، انھوں نے بھی کچھ اس انداز سے پوچھا کہ انکار نہ کر سکے (ویسے بھی ایسے موقعوں پر انکار وسیع تر ذاتی مفاد کے خلاف ہوا کرتا ہے)۔ خیریت پوچھنے کے بعد وہ سمجھاتے ہوئے بولے:

''دیکھو بھئی، اگر دریا میں رہنا ہو تو مگرمچھ سے دوستی کر لینی چاہیے''

(تاکہ لدھر اور مچھلیاں وغیرہ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکیں)۔

''کبھی دریا میں گھر بنایا تو ایسا ہی کریں گے۔'' ہم نے ان کی بات کو ہنسی میں اڑا دیا۔

''سی سی سی! آپ تو مذاق پر اتر آئے۔'' وہ پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے بولے۔

(چوں کہ ان کے اگلے تین دانت نہیں تھے، اس لیے ''کھی کھی'' کی آواز ''سی سی'' بن کر نکلتی تھی۔ کہیں آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ مادام نے چائے میں مرچیں زیادہ ڈال دی تھیں۔)

غرض اس ساری گفتگو اور چائے کا لا حاصل بالترتیب یہ تھا کہ ہم پرنسپل صاحب سے معذرت کرتے ہوئے اضافی ذمہ داریاں قبول کر لیں اور وائس پرنسپل صاحب سے کچھ سبق سیکھیں، جو سرکاری افسروں کے سدھائے ہوئے ہیں، نہ کوئی کام کرتے ہیں، نہ کوئی ذمہ داری قبول کرتے ہیں، محض جی حضوری کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے۔ جب تک پرنسپل صاحب گھر نہ چلے جائیں، وہ اسکول میں بیٹھے خالی پیٹ اونگھتے رہتے ہیں۔ نیز اگر سائنس دان فلش کے ساتھ ساتھ کوئی ایسا سسٹم ایجاد کر دیتے کہ ایک کے بدلے دوسرا فارغ ہو جایا کرتا تو انھیں یقین ہے کہ پرنسپل صاحب کی یہ خدمت بھی وہ اپنے سر لے لیتے!

سب کچھ غور سے سننے کے بعد ہم نے ان کی سونپی ہوئی نئی ذمہ داریوں کے بجائے اپنی پرانی سائیکل سنبھالی اور فاقہ مستی میں کامی سے آ ملے کہ:

کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی!

راول پنڈی 1976ء

یلدرم کی پیروی میں

مہرباں ہو کے بلا لو، مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ایک بار طبیعت خراب ہوئی اور بیماری کافی طول پکڑ گئی۔ افسردہ خاطر بستر پر پڑے ملک الموت کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک وہ آ دھمکی:

''نفسیات کی رُو سے تمام بیماریوں کا تعلق انسان کے ذہن سے ہوتا ہے اور آپ کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ آپ جگر کے مریض ہیں، اسی لیے آپ کو بار بار بخار آ رہا ہے۔''

''ڈاکٹر نے معائنہ کرنے اور لیبارٹری ٹیسٹ کے نتائج دیکھنے کے بعد یہی بتایا ہے۔''

''ڈاکٹر اپنے مریضوں کی نفسیات کو پسِ پشت ڈال کر صرف طبی آلات پر بھروسا کرتے ہیں اور یوں انھیں اپنی طبعی موت نہیں مرنے دیتے۔ دراصل یہ بخار نہیں، بلکہ قوتِ متخیلہ کے بخارات ہیں جو آپ کے ذہن کو پراگندہ کیے ہوئے ہیں۔ جس کی میرے نزدیک تین وجوہات ہیں، یعنی آپ کے لاشعور میں جگر سمایا ہوا ہے، تحت الشعور میں بخار نے ڈیرہ ڈالا ہوا ہے اور..... اور شعور تو آپ میں سرے سے ہے ہی نہیں!''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو...؟''

''دیکھا آپ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے، پتا ہے کیوں؟''

''اس لیے کہ تم نے لاشعوری طور پر میرے ہاتھ پہ ڈیرہ ڈال دیا ہے!''

''جی نہیں، آپ اس لیے اٹھ گئے کہ آپ کا ذہن اچانک بیماری کو بھول کر شعور کی طرف چلا گیا کہ یہ کس بلا کا نام ہے۔''

اپنی بیماری کے بارے میں پہلی دو وجوہ تو کسی حد تک گوارا تھیں، مگر تیسری انتہائی ناقابلِ برداشت تھی، اس لیے ہم نے سنجیدگی سے اس کا علاج دریافت کیا تو ثروت خالص نفسیات کی زبان پر اتر آئی اور اسی وقت کسی انگریزی کتاب سے، درج ذیل اقتباسات لفظی ترجمے کے ساتھ ایک ہی سانس میں سنا ڈالے:

''یہ ٹھیک ہے کہ فن دنیا کی عظیم ترین چیز ہے، مگر اسے ہم عظیم ترین نہیں قرار دے سکتے، ادراک کی تمام اقسام میں سے علت و معلول کا مسلسل ادراک اہم ترین حیثیت کا حامل ہے۔ بہ الفاظِ دیگر کائنات کی مسلسل ارتقا پذیری کا ادراک، یا سیدھے سادے الفاظ میں خود عملِ ارتقا کا ادراک..... نیز جب انسان اس اہم ترین حقیقت کو ذہن نشین کر لیتا ہے کہ ہر وقوعہ کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی علت ضرور کارفرما ہوتی ہے اور یہ

علت ہی ہے جس کی اساس پر معلول کی رفیع الشان عمارت استوار ہوتی ہے تو اس احساس کی بنا پر صرف کشادہ ذہنی ہی نہیں، بلکہ کبھی کبھار عالی ظرفی بھی پیدا ہوتی ہے..... جس کا آپ میں فقدان ہے۔''

شاید اسے خود بھی معلوم نہ ہو کہ اس نے جو رٹا لگایا ہے اس کا مطلب کیا ہے، مگر چوں کہ وہ بی اے میں نفسیات کی طالبہ رہ چکی ہے اور گزشتہ 5 سال سے نفسیات میں ایم اے کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور ہم اس کی (نفسیات کی) ابجد سے بھی واقف نہیں، اس لیے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

''بھئی تم آخر کہنا کیا چاہتی ہو ذرا سلیس اُردو میں بیان کرو۔'' ہم میں مزید کچھ سننے کی تاب نہ رہی۔

وہ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی:

''آپ اب کسی سے ملتے نہیں، کہیں آتے جاتے نہیں (حالاں کہ ہم اپنے بڑے بھائی سے بہت ملتے ہیں اور ہر روز دفتر آتے جاتے ہیں)۔ میری سہیلیوں کے علاوہ کوئی اور بھولا بھٹکا گھر پر آ جائے تو اسے بالکل اہمیت نہیں دیتے۔ بی اے کے امتحان میں میری فرسٹ ڈویژن اسی وجہ سے آئی کہ میں زمانہ طالب علمی میں بھی خاندان بھر میں ہونے والی تقریبات میں بن بلائے شریک ہوتی رہی ہوں، جب کہ آپ نے اپنا تمام ترقیمتی وقت پہلے پڑھنے میں برباد کیا اور اب لکھنے میں! یہی وجہ ہے کہ آپ امتحان میں میرا مقابلہ نہ کر سکے اور نتیجتاً مجھ سے ایک درجہ پیچھے رہے...... پھر آپ کسی چھوٹے بڑے کی بات نہیں مانتے، بس اپنی ہی چلائے جاتے ہیں اور یہی چیز آپ کی مسلسل خرابیِ صحت کا سبب ہے۔ اگر صحت مند رہنا چاہتے ہیں تو میر بننے کے بجائے اپنے فرمائے ہوئے کو غیر مستند تسلیم کرتے ہوئے ٹھنڈے دل سے لوگوں کی بات سنا کیجیے، چاہے عمل کریں یا نہ کریں۔''

''مگر زندگی تو عمل سے ہی بنتی ہے......''

''میں آپ کی زندگی کی نہیں، صحت بنانے کی بات کر رہی ہوں!''

ہم کوئی جواب نہ دے سکے تو بولی:

دیکھیے، لوگ ہمدردی کے طالب ہوتے ہیں، ان سے ہمدردی کیا کیجیے...... بس تو ہو گیا فیصلہ، آج سے رات کا کھانا پکانا بند، آرام سے دوسروں کے ہاں روٹیاں توڑیں گے، ابھی تو ہم پر کوئی ذمہ داری بھی نہیں ہے......''

کھانے کا ذکر کر کے ہم کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتے، البتہ کچھ عرصے بعد یہ بات حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی کہ لوگ واقعی ہمارے عاشق ہو گئے اور چند دن بعد ہمیں کہیں جا کر وقت اور کرایہ ضائع کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، مثلاً:

ایک صاحب ہیں جو تقریباً ہر جمعہ فجر کی نماز پڑھتے ہی ہمارے گھر کا رخ کرتے ہیں، اور گھنٹی کے بٹن پر سے ہاتھ اس وقت تک نہیں اٹھاتے، جب تک کہ ہمیں نہ اٹھا لیں۔ یہ دروازہ کھلتے ہی عموماً ڈانٹتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں، خدا سے ڈرو، بینکر ہو کر اتنا سوتے ہو؟ اس زوردار تنبیہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گھر کے جو افراد بینکر نہیں ہیں، وہ بھی خدا سے ڈرتے ہوئے ہڑبڑا کر اپنے اپنے بکروں سے باہر نکل آتے ہیں۔ پھر گرمی ہو تو چادر اور سردی ہو تو کمبل طلب کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہمارا تکیہ سونگھتے ہیں اور تیل کی مہنگائی کا رونا روکر تاکید کرتے ہیں کہ ادیبوں کو

فارسی نہیں پڑھنی چاہیے ورنہ طبیعت تیل کے کاروبار کی طرف راغب ہو جاتی ہے، اور نہ ہی اپنے سر پر زیادہ تیل لگانا چاہیے، اس سے مضامین مشکل اور چکنے چپڑے ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنا تازہ ترین مسئلہ حل کرنے کے لیے بستر پر دراز ہو جاتے ہیں اور یوں ہمیں جگا کر خود سو جاتے ہیں۔ ایک بینک سے تعلق ہے، اس لیے قرض لینے کی عادت پختہ ہو چکی ہے۔ شہر میں، یا شہر سے باہر کہیں بھی جائیں، میزبان سے بلا جھجک قرض مانگ لیتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ انسان کو اپنے مسائل کا حل اور قرض خواہ گھر سے باہر نکل کر خود تلاش کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ کوئی نہ کوئی ٹارگٹ (خواہ وہ نیند کا ہی کیوں نہ ہو) پیشِ نظر رہتا ہے۔ اب جب تک وہ اپنا مسئلہ حل نہ کرلیں (نیند کا ٹارگٹ پورا نہ کرلیں، بلکہ رقم کا تعین نہ کرلیں) اس وقت تک بادلِ نخواستہ گھر پر ہی رہنا پڑتا ہے۔ چوں کہ بینک میں ملازم ہیں، اس لیے رقم زیادہ چلی جائے تو کبھی واپس نہیں کرتے، قرض کی ادائیگی البتہ پارٹی کا چیک سمجھتے ہوئے ہمیشہ کم اور دیر سے کرتے ہیں۔ نیز بیرونِ شہر لیے گئے قرضہ جات ہمارے توسط سے بذریعہ DD/TT ادا کرتے ہیں، تاکہ سند رہے۔ جب بھی وہ DD یا TT کی ایڈوائس دیتے ہیں بیگم کو فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ یہ ہر دوسری تیسری ملاقات میں ہمیں DDT کیوں دیتے ہیں۔ آپ کا نمونہ کلام کچھ یوں ہے:

''برانچ کا ڈپازٹ تو گرا ہی تھا، کل شام بچہ بھی گر گیا۔ ایک پارٹی نے قرضہ کی درخواست دی تو مجھے تمھارے بھائی کا خیال آیا، جن سے میں نے راول پنڈی میں قرضہ لیا تھا، کمیشن کی رقم سے ڈی ڈی بنانے پر بیٹھا تو ریلوے کا ٹی ای یاد آ گیا، جس نے دورانِ سفر پیسے لینے کے باوجود ٹکٹ بنا کے نہ دیا۔ برانچ ذرا اٹھی تھی کہ بہن گھر آ کر بیٹھ گئی۔ ایک صاحب نے اپنا لون ایڈجسٹ کرایا تو مجھے بیگم کی منگائی ہوئی لان یاد آ گئی''، وغیرہ وغیرہ۔

دوسری مصیبت یہ ہے کہ ہر بات کا جواب، خواہ نفی میں ہی مقصود ہو ''جی ہاں'' کہہ کر دیتے ہیں اور ان سے کچھ اس قسم کی گفتگو ہوتی ہے کہ ان کا سونا ان کے بولنے اور قرض مانگنے سے زیادہ خوش گوار لگتا ہے!

ہم: مبارک ہو اس مرتبہ تو بینک کے امتحان میں خلافِ توقع پہلے ہی مرحلے میں کامیاب ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے نقل کی ہے!

وہ: جی ہاں!

ہم: جھوٹ بول رہے ہو!

وہ: جی ہاں!

ایک اور حضرت ہیں، جو انشورنس ایجنٹ ہونے کے باوجود انتہائی کم گو اور کسی قدر بے ضرر واقع ہوئے ہیں۔ یہ عموماً عام تعطیلوں میں ہی وارد ہوتے ہیں۔ جمعہ کے دن گھر سے نکلنا پسند نہیں کرتے کہ کہیں کوئی نماز کی بابت پوچھ بیٹھے (کہ کہاں پڑھی) اور عبادت کے باب میں جھوٹ بولنا انھیں ذرا معیوب سا لگتا ہے۔ آپ انشورنس کے علاوہ بھی ان سے کوئی بات کریں تو جواب میں درج ذیل دو ہی جملے بولتے ہیں یعنی ''چلو یہ بھی اچھا ہوا'' اور ''بہت خوشی ہوئی'' مثلاً:

ہم: پچھلے مہینے عرفی کے پھوپھی زاد کا انتقال ہو گیا۔

وہ: چلو یہ بھی اچھا ہوا، پالیسی تو خرید لی تھی ناں!

ہم: مرحوم دل کے مریض تھے۔

وہ: بہت خوشی ہوئی، لیکن ایسے لوگوں کا بیمہ ذرا مشکل سے ہوا کرتا ہے۔

ہم: بیوی تو ابھی بالکل جوان ہے۔

وہ: چلو یہ بھی اچھا ہوا، دوسرے شوہر کی پالیسی لے سکتی ہے۔

ہم: بے چاری کی تین سال قبل ہی مرحوم سے شادی ہوئی تھی۔

وہ: بہت خوشی ہوئی، اب تین سال بعد پھر ہو جائے گی۔

اگر کبھی یہ دو جملے بھی زیادہ معلوم ہوں تو پھر تمام تر گفتگو کا انحصار صرف اس ایک جملے پر ہوتا ہے اور اس صورت میں ان سے کچھ اس قسم کا تبادلۂ خیال ہوتا ہے کہ سر پھوڑنے کو جی چاہتا ہے (ان کا):

ہم: بڑا افسوس ہوا، آپ اس سال بھی ترقی نہ کر سکے۔

وہ: یہ سب آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ہم: مبارک ہو، آپ کے ہاں پھر لڑکا پیدا ہوا۔

وہ: یہ سب آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے!

اب ہم ان سے کیا بات کریں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گم سم بیٹھے دیر تک ایک دوسرے کا منہ تکتے رہتے ہیں۔

ہمارے بیوی بچوں کے بہت خیر خواہ ہیں۔ ہم نے انھیں ان کے مستقبل کی طرف سے ہمیشہ فکر مند ہی پایا ہے کہ جب ہم نہ ہوں گے تو ان بے چاروں کا کیا ہوگا۔ انھیں یقین ہے کہ اگر ہم بیمہ پالیسی لے لیں تو وہ ان کی خدمت کے لیے ضرور موجود ہوں گے، مگر ہم بھی بغیر پریمیم دیے پچھلے کئی سال سے انتہائی پالیسی سے کام لے رہے ہیں۔

ایک بزرگوار ہیں جو چاند کی طرح مہینے میں ایک بار ہی نکلتے ہیں اور تقریباً ہر مرتبہ انتہائی تجسس اور راز داری سے یہ ضرور پوچھتے ہیں کہ کھانا خود پکاتے ہو، یا پکا پکایا مل جاتا ہے۔ بارہا عرض کر چکے ہیں کہ پہلے پکی پکائی مل جایا کرتی تھی، مگر اب ہماری شادی ہوگئی ہے! لیکن وہ ہر بار بھول جاتے ہیں۔ پھر کچھ یوں گویا ہوتے ہیں، میرے استاد خدا انھیں جنت نصیب کرے، کھانا خود پکایا کرتے تھے، میرا بھانجا، خدا اسے روزگار نصیب کرے (تو اپنا داماد بناؤں) بہت ہی سیدھا بچہ ہے۔ میری بیٹی، خدا اسے اچھا بر نصیب کرے، بہت ہی سگھڑ ہے۔ میرا لڑکا، خدا اسے سپلیمنٹری میں کامیابی نصیب کرے، بڑا ہی ذہین ہے، حتیٰ کہ وہ خود خدا انھیں زندگی (مگر ہمارے خیال میں عقل) نصیب کرے، بچپن میں بہت ہی شریر ہوا کرتے تھے، وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ ان کی گفتگو کا محور دنیا میں بس دو ہی آدمی ہیں، ایک ہمارے بڑے بھائی اور دوسرے بہنوئی۔ اتفاق سے دونوں ایک نام

اور دو قالب ہیں اور دونوں کے بچے بھی پانچ پانچ ہیں اور دونوں رہتے بھی راول پنڈی میں ہیں۔ اوّل الذکر ایک بینک میں اور مؤخر الذکر ایک بیرونی فضائی کمپنی میں ملازم ہیں۔ یہ صاحب ہمارے بہنوئی سے بہت قریب ہیں۔ ملاقات کے وقت ہماری خیریت کبھی دریافت نہیں کرتے۔ تقریباً ہر بار گفتگو کا آغاز اس طرح سے کرتے ہیں:

''مسرور میاں کا کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہیں۔''

''ان کے اب کتنے بچے ہو گئے۔''

''جتنے پچھلی ملاقات میں تھے، پانچ!''

''آج کل کہاں ہیں؟''

ان کا یہ سوال خالصتاً اپنے بھائی سے متعلق معلوم ہوتا ہے (کیوں کہ بلی اپنے بچوں کو لے کر سات گھر، جن کی تعداد روایات میں سات آئی ہے، اور بینک منیجر برانچ بدلتے رہتے ہیں) اس لیے ہم جواب دیتے ہیں:

''فلاں برانچ میں منیجر ہیں۔''

''وہ تو پہلے کسی ایئر لائن میں نہیں تھے؟''

''اچھا وہ! وہ تو اسلام آباد میں ہی ہیں۔''

''ان کا بڑا لڑکا کیا کر رہا ہے؟''

یہ سوال سو فی صد بہنوئی سے متعلق سمجھتے ہوئے جواب دیتے ہیں:

انٹر میں ہے!

(چونک کر) ''ہیں، کیا اسکول میں پیدا ہوا تھا؟''

''اچھا! آپ بھائی صاحب کے لڑکے کا پوچھ رہے ہیں، وہ تو ابھی آٹھویں میں ہے۔''

''اور بڑی لڑکی کیا کر رہی ہے؟''

اب ہم کیا، آپ بھی ہوں تو اپنی بھتیجی کا ہی حال بتائیں گے۔

''وہ میٹرک میں ہے!''

''ابھی تک میٹرک میں ہی ہے؟''

''اچھا! آپ ان کی بچی کے بارے میں پوچھ رہے ہیں، وہ غالباً A, Levels کر رہی ہے۔''

یہ بھی شکر ہے کہ ان دونوں کے علاوہ یہ کسی اور کے متعلق بات کرنا پسند نہیں فرماتے، ورنہ اچھے خاصے انسان کو دیوانہ کر دیں۔ اگر ہم کبھی

اپنے تجربے کی روشنی میں جوابات کی ترتیب بدل دیں تو پھر وہ اپنے سوالات کا رخ موڑ دیتے ہیں۔

ایک اور عزیز ہیں، جو تاجر برادری سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک چیز کا دوسری سے موازنہ کر کے کوئی نہ کوئی فائدہ تلاش کرتے رہتے ہیں مثلاً اگر شاہجہاں آگرہ میں تاج محل بنوانے کے بجائے ممتاز محل کو مہر کی نقد ادائیگی کر دیتا تو اس کی وفات کے بعد وہ رقم دوبارہ اسی کو مل جاتی (بھلا محل کے لیے محل بنوانے کی کیا ضرورت تھی؟)۔ اورنگزیب ٹوپیاں سینے کی بجائے بادشاہت چھوڑ کر ریڈی میڈ گارمنٹس کا کاروبار کر لیتے تو زیادہ روپیہ کماتے، اکبر دینِ الٰہی ایجاد کرنے کے بجائے کوئی ڈھنگ کی چیز ایجاد کر لیتا تو کافی زرِ مبادلہ کماتا۔ محمود غزنوی ایک ہی ملک پر سترہ بار حملہ آور ہونے کے بجائے مختلف ملکوں کو نشانہ بناتا تو زیادہ مالِ غنیمت پاتا۔ فلاں صاحب تعلیم حاصل کر کے سرکاری ملازمت اختیار کرنے کے بجائے رقم جمع کر کے اس سے کوئی کاروبار کر لیتے تو زیادہ فائدے میں رہتے، حتیٰ کہ ہم اگر ایک کے بجائے دو شادیاں کر لیتے تو زیادہ نفع ہوتا (ڈبل جہیز ملتا) وغیرہ وغیرہ۔ ان کی صرف یہی بات ہمیں پسند ہے اور ہم اسی لیے اب تک انھیں برداشت بھی کر رہے ہیں (کہ کب ان کی زبان مبارک ہو جائے) ویسے بھی ثروت کو پتا چلے گا تو خود اُن سے نمٹ لے گی، ہم کیوں خواہ مخواہ اپنے تعلقات خراب کریں؟

ایک جاننے والے ہیں، جو ہماری ہمدردی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے تقریباً ہر ہفتے ہی ازدواجی مسائل اور اہلیہ کو ساتھ لیے ہمارے ہاں تشریف لاتے ہیں۔ ان کا تکیہ کلام ہے، ''آپ کی دعا سے'' لہٰذا اندازِ گفتگو کچھ یوں ہوتا ہے:

''آپ کی دعا سے بیگم پرسوں اچانک بیمار پڑ گئیں۔ آپ کی دعا سے ان کا پارہ پورے 105 ڈگری تک جا پہنچا، یہاں تک کہ آپ کی دعا سے (بیگم کے ٹھیک ہوتے ہی) کل پھر ہمارا جھگڑا ہو گیا۔''

کئی بار عرض کیا کہ ہم نے اب تک اپنے لیے بھی کبھی دعا نہیں کی (ہمیشہ دوا سے ہی کام چل گیا) بھلا پھر ان کے لیے کیسے دعا کر سکتے ہیں، مگر وہ یہ جملہ ضرور دہراتے ہیں۔ دوسری مصیبت یہ ہے کہ اپنے گھریلو جھگڑے میں ثالث بھی یہ کہتے ہوئے ہم ہی کو بناتے ہیں کہ ہم امن پسند ہیں، منصف ہیں، اور ہمارے دادا وکیل تھے۔ کئی بار سمجھایا کہ ہم مصنف ہیں، منصف نہیں، اور ہمارے دادا وکیل تھے، جج نہیں، لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ نیز ہمیں جبراً و قہراً انھی کی طرف داری کرنا پڑتی ہے، کیوں کہ امن پسندی، بلکہ عقل مندی کا تقاضا یہی ہے۔ پھر ان کی اہلیہ کی حمایت میں اپنی اہلیہ کی مخالفت مول لینا زیادہ خطرناک ہے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار ان کے آرام کا خیال رکھتے ہوئے اپنی نوجوان ملازمہ سے ناشتا بنوا کر کھلایا تو کئی روز تک ناشتے میں ڈبل روٹی، مکھن اور طعنے ملتے رہے (کیوں کہ جیم ختم ہو چکا تھا)۔

ایک اور ملنے والے ہیں، جو پہلے کبھی کبھار تشریف لایا کرتے تھے، مگر اب پابندی سے آنے لگے ہیں، کیوں کہ ہم دونوں میاں بیوی ان کی کبھی سمجھ میں نہ آنے والی باتیں پوری توجہ اور ثابت قدمی سے سننے کے ساتھ ساتھ انھیں اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازتے رہے ہیں، لہٰذا جب بھی کوئی مشکل درپیش ہوتی ہے، یاد کر لیتے ہیں۔ آپ کا بی اے میں متواتر پانچ سال تک نفسیات پڑھنے کا دائمی ریکارڈ قائم ہے، کیوں کہ انھوں نے ہمیشہ وقت کی قید سے آزاد ہو کر تعلیم کو محض سند حاصل کرنے کا ذریعہ بنانے کے بجائے علم سے پورے طور پر بہرہ ور ہونے کو ترجیح دی ہے۔ یہ پہلے انگریزی بولتے ہیں، اور پھر اس کا براہِ راست اُردو ترجمہ نشر کرتے ہیں۔ ایک روز اکتا کر کہا کہ یا تو انگریزی زبان میں گفتگو کیا کریا پھر اُردو بولا کرو۔ ہم نے دونوں زبانیں بیک وقت بولتے ہوئے اس سے پہلے کسی کو نہیں سنا، تو ہنس کر بولے:

"What can I do, This is my bad habit!"

''میں کیا کروں، یہ میری بری عادت ہے!''

ایک اور صاحب ہیں، جو انتہائی تفصیل سے بات کرنے کے عادی ہیں، اس لیے ان سے بات چیت میں پہل کرتے ہوئے ذرا ڈر سا لگتا ہے کہ ادھر ہم کوئی سوال کریں اور اُدھر وہ سیاق و سباق کے حوالے سے تشریح شروع کر دیں۔ بعض مرتبہ تو ان پر کسی خاتون کا سا گمان گزرنے لگتا ہے، اس لیے حتیٰ الامکان کوشش یہی ہوتی ہے کہ ہماری خیریت وغیرہ وہ خود دریافت کرلیں اور ہمیں بولنا نہ پڑے، مگر ایسا کم ہی ہوتا ہے، کیوں کہ ان کے آنے پر عمر اور سنت کا لحاظ رکھتے ہوئے سلام میں پہل ہمیں کو ہی کرنا پڑتی ہے اور جواب ملنے کے بعد پھر پہلا سوال بھی عموماً ہماری ہی طرف سے ہی ہوتا ہے، مثلاً ایک بار ہم ان کی صحت اور مکان کے متعلق پوچھ بیٹھے تو انھوں نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بتایا کہ مکان بنوانا جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ پھر یہ بتایا کہ زمین کیوں کر حاصل کی، رجسٹری کس طرح کروائی، بنیادیں کھدوانے کے دوران کون کون سی بنیادی مشکلات پیش آئیں، اینٹیں کس طرح حاصل کیں، وہائٹ سیمنٹ، بلیک میں کس طرح اور کہاں سے خریدا، بجری اور ریتی کا انتظام کیوں کر ہوا، مزدوروں کو ایک پلیٹ فارم پر کیسے جمع کیا، ان پر نگہبان کسے مقرر کیا، کام کیوں کر شروع ہوا، اور اس دوران میں کیا کیا رکاوٹیں اور مالی مشکلات پیش آئیں۔ خدا خدا کر کے مکان مکمل ہوا۔ ہم اٹھنے ہی والے تھے کہ اچانک مکان کرائے پر اٹھ گیا اور ہم بیٹھ گئے۔ اب انھوں نے مالک مکان اور کرایہ دار کے نازک رشتے پر سیر حاصل مقالہ سنایا۔ چائے لانے کے بہانے سے اٹھنے لگے تو بولے، برخوردار! میری صحت کے بارے میں کیے گئے اپنے سوال کا جواب سن لو، پھر بھی چائے بنوانے کی گنجائش باقی رہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اب صحت کے بجائے پہلے چائے کی کہانی شروع ہوئی کہ خرچ کے علاوہ چائے سے قبض بھی ہوتا ہے جو 72 امراض کی ماں ہے۔ اب قبض کے ان 72 بچوں کی علامات، علاج اور پرہیز، اس کے علاوہ یونانی، آیورویدک، ہومیو پیتھک، ایلو پیتھک اور ایکوپنکچر طریقۂ علاج۔ پھر ایلو پیتھک طریقۂ علاج اپنانے کی صورت میں قبض کے ان بچوں کے علاج کے دوران پیدا ہونے والے دیگر بچوں (موذی امراض) کی علامات، علاج اور side effects۔ نقصانات گنوانے کے باوجود ہر بار چائے ضرور پیتے ہیں۔ ان سے مل کر نہ صرف یہ کہ سگریٹ کا اشتہار ''خبردار تمباکو نوشی صحت کے لیے مضر ہے'' یاد آ جاتا ہے، بلکہ اُن افسانوں کی یاد بھی تازہ ہو جاتی ہے، جن میں مصنف اپنا پورا زور اصل کرداروں کو چھوڑ کر جزئیات نگاری پر لگا دیتا ہے۔

بیگم کی بیماری کا بہانہ کر کے اٹھنے لگے تو بولے، کیا تم اپنی اہلیہ سے بالکل ہی عاجز آ گئے ہو۔ ہم نے نفی میں سر ہلایا تو بولے، پھر انھیں ڈاکٹر کے پاس کیوں لے کر جا رہے ہو؟

یہ صرف ایک ملاقات کی تفصیل مختصراً بیان کی ہے، عقل مند کیلئے اشارہ کافی ہے، باقی ملاقاتوں پر خود قیاس، بلکہ علیٰ ہذا القیاس کر لیں

.....لیکن ثروت اب بھی بضد ہے کہ ہر وقوعہ کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی علت (خواہ وہ ہماری مہمان نوازی، یا نا اہلی ہی کیوں نہ ہو) ضرور کارفرما ہوتی ہے۔

ایسی بیوی کا کیا کرے کوئی!

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد

وہ صبح سویرے ہی گرم گرم چائے بنا کر لے آتی اور دونوں مزے سے اپنے کمرے میں چائے پیتے۔ پھر وہیں پر گیارہ بجے ناشتا ہوتا اور تین بجے کھانا۔ دن بھر آرام کرتے اور شام کو سیر وتفریح۔ ہر روز کسی نئی جگہ پر کھانا کھاتے، گھومتے پھرتے اور عموماً رات کو بارہ بجے کے بعد گھر لوٹتے۔ اِدھر کپڑے میلے ہوئے، اُدھر اس نے دھو ڈالے۔ ایک بار منع کیا تو بولی، ''اب میں آ گئی ہوں آئندہ کوئی دھلائی اور سلائی نہیں ہوگی۔'' ہم کبھی شام کو کہیں چلے جاتے تو جب تک واپس نہ آ جاتے، جاگتی رہتی اور کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی۔ کرنے کو اور کچھ نہ ہوتا تو آدھی رات کو برتن ہی دھونے بیٹھ جاتی۔ کئی بار کہا کہ کھانا کھا کر سو جایا کرو، مگر وہ نہ مانتی اور ہر بار یہی کہتی کہ اسے انتظار کرنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ میکے جاتی تو ہمارے جواب کا انتظار کیے بغیر پابندی سے خط لکھتی۔ واپس آنے پر اس سے معذرت کرتے تو کہتی کہ مردوں کے پاس وقت کم ہوتا ہے، کیوں کہ وہ دفتر سے آنے کے بعد بھی اپنے ذاتی کاموں میں ہی الجھے رہتے ہیں! کامی سے اس کی تعریف کی تو کہنے لگے، موازنہ ہمیشہ دو چیزوں میں ہوا کرتا ہے، اگر دوڑ میں ایک گھوڑا حصہ لے گا تو وہ خواہ کسی رفتار سے بھی دوڑے اوّل ہی رہے گا، اس لیے بھابی کے بارے میں اپنا فیصلہ اس وقت تک محفوظ رکھو جب تک کہ دوسرا گھوڑا نہ لے آؤ! پھر اگر تم ثابت رہے تو فیصلہ کر کے بتانا کہ کون سی بیوی اچھی ثابت ہوئی۔ چوں کہ بات معقول تھی، اس لیے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔

ابتدائی دنوں کی بات ہے، ہم میکے میں تھے (اس کے) اور ابھی ایک دوسرے کو صحیح طور پر سمجھنے بھی نہ پائے تھے کہ اچانک ہمیں اس کی کسی بات پر غصہ آ گیا اور ہم نے بول چال بند کر دی۔ خلافِ توقع وہ تو بلا کی ضدی نکلی اور کسی طرح پہل کر کے نہ دی۔ اِدھر ہم بھی اڑے رہے، اور یوں ہماری دو قیمتی چھٹیاں انا کی نظر ہو گئیں۔ تیسرے روز دوپہر کو مطالعے میں غرق تھے کہ اچانک کسی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ کتاب چھوڑ چھاڑ ساتھ والے کمرے میں گئے تو دیکھا وہ مسہری پر اوندھی پڑی زار و قطار رو رہی ہے۔ ہم چپ چاپ ایک کونے میں کھڑے ہو گئے۔ گھر کے تقریباً سب ہی افراد باری باری آئے اور اس سے رونے کی وجہ پوچھی، مگر اس نے بڑوں کو ڈانٹ کر اور چھوٹوں کو مار پیٹ کر بھگا دیا۔ غصے کا یہ بچکانہ انداز ہمیں اتنا بھلا لگا کہ اسی وقت اس کی اگلی پچھلی سب خطائیں معاف کر ڈالیں، اور اسے منانے کے لیے آگے بڑھے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہم سے نہ رہا گیا اور زائل شدہ توانائی کی بحالی کے لیے اسے باہر لے جا کر جوس پلانے کی پیش کش کی تو فوراً ہچکیاں اور سسکیاں لیتے ہوئے تیاری میں مصروف ہو گئی۔

اب تو اس کی ایک کمزوری ہاتھ آ گئی، اور ہم نے اسے تنگ کرنے کا پنجسالہ منصوبہ بنایا۔ چناں چہ اگلی ہی صبح ایک دوست کے نام فرضی ساخط لکھا اور اسے تکیے کے نیچے رکھ کر خود باہر نکل گئے۔ وہ کمرے کی صفائی کرنے آئی اور بستر جھاڑا تو خط نیچے آ رہا۔ ہر چند کہ یہ اخلاقی

جرم تھا مگر اس نے پھر بھی اخلاقاً یہ چند سطریں پڑھ ڈالیں۔ کچھ دیر بعد ہنستے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تو ہمیں دیکھتے ہی اس نے غصے سے منہ پھیر لیا۔ ہم نے بھی کوئی خاص توجہ نہ دی اور بالکل ان جان سے بن گئے۔ تھوڑی دیر بعد گیارہ بجے کی چائے لے کر آئی تو اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں آنسو بہانے کو تیار تھیں۔ ہم نے یوں ہی اس سے سردرد کی گولیاں مانگیں اور چپ چاپ چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔ کچھ دیر بعد خط ہماری طرف بڑھاتے ہوئے بولی، ''ویسے میں کبھی کسی کا خط نہیں پڑھتی، لیکن میری نظر خود بخود اس خط پر پڑ گئی اور میں اسے پورا پڑھ گئی۔ آپ خاندان میں شادی کرنا نہیں چاہتے تھے اور آپ کا آئیڈیل کوئی اور تھا، تو آپ نے اس بات کو اب تک مجھ سے کیوں چھپائے رکھا، آپ نے مجھے صرف یتیم سمجھ کر شادی کی ہے اس کے پیچھے اور کوئی جذبہ نہ تھا؟'' پھر غصے سے گولیاں دیتے ہوئے بولی ''یہ کھا کر مجھے بتائیں آپ کسے پسند کرتے ہیں۔'' یہ بات تو ہم گولیاں اور گالیاں کھائے بغیر بھی بتا سکتے تھی، مگر ہمارا پروگرام اسے ستانے کا تھا، منانے کا ہرگز نہیں، اس لیے کوئی جواب نہ دیا اور وہ کئی روز تک پیچھے پڑی رہی۔

شروع میں حد درجہ حساس اور نازک مزاج تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر دیر تک سوچتی رہتی اور پھر آپ ہی آپ رونے بیٹھ جاتی۔ اکثر اوقات ہمیں ناراضگی کی وجہ بھی معلوم نہ ہوتی مثلاً، ایک شام وہ ہمارے برابر بیٹھی تھی اور ہم اس کی بڑی بہن سے (جو اعلیٰ قسم کا ادبی ذوق اور بنگالی شوہر رکھتی ہے!) اُردو کی مزاحیہ شاعری پر بحث کر رہے تھے، اور مختلف نظموں سے اشعار سنا سنا کر ایک دوسرے پر ہنس رہے تھے۔ اس دوران یہ بار بار کہنی مار کر ہمیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی رہی، مگر ہم اسے جلانے کی خاطر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ہماری یہ حرکت اسے بہت بری لگی۔ رات کو سونے کی تیاری کر رہے تھے تو قریب آ کر بیٹھ گئی اور رونا شروع کر دیا۔ وجہ معلوم کی تو آنسو پونچھتے ہوئے بولی، ''یہ لیجیے اپنے پیسے، آپ نے کل پانچ سو روپے دیے تھے، پچاس مجھ سے خرچ ہو گئے، جب ہوں گے تو وہ بھی لوٹا دوں گی۔ اور یہ رہا آپ کا لایا ہوا جوتا، ابھی صرف ایک بار ہی پہنا ہے۔ آپ مجھے 'اپنوں' کے سامنے نظر انداز کرتے ہیں تو میں بھی آپ کی دی ہوئی کوئی چیز قبول نہیں کروں گی۔ (دوبارہ روتے ہوئے) اب تو میں آپ کو مل گئی ہوں نا، اس لیے!'' ہم نے اسے آئندہ نظر انداز نہ کرنے کا عہد کیا اور اپنی پس انداز شدہ رقم جیب میں ڈالتے ہوئے یقین دلایا کہ اب ہم کسی دوسرے سے بات کرتے وقت بھی بے وقوفوں کی طرح ٹکٹکی باندھے اسی کو دیکھا کریں گے تو ایک دم خوش ہو گئی، اور اسی وقت روپے اور جوتے ہمارے ہاتھ سے چھین لیے (ویسے کامی کہتے ہیں کہ اپنے سامنے کبھی بھی بیوی کے ہاتھ میں جوتا نہیں دینا چاہیے۔)

ایک مرتبہ ہم اس سے واقعی ناراض ہو گئے۔ اس نے کئی بار منانے کی کوشش کی، مگر ناکام رہی۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ آخر تنگ آ کر اُس نے ایک معافی نامہ لکھا اور ہمارے سرہانے رکھ دیا۔ ہم پھر بھی لاتعلق سے رہے تو وہ بھی مکمل طور پر پیچھے ہٹ گئی۔ ایک رات گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا سر پر دوپٹہ باندھے بستر پر پڑی ہے۔ چہرہ زرد اور بدن سرد ہو رہا تھا۔ ہم ٹھٹک گئے کہ کہیں ذوقؔ آج جہاں سے تو نہیں گزر گیا۔ بغور جائزہ لیا تو سانس چلنے کا احساس ہوا۔ جان میں جان آئی۔ اسی وقت اسے سوتے سے اٹھایا اور منانے کی کوشش کی، مگر وہ نہ مانی۔ آخر بڑی مشکلوں سے اسے منایا تو ایک دم اٹھ بیٹھی اور آنکھیں ملتے ہوئے بولی، ''پتا ہے، اب میں نے آپ سے کبھی نہ بولنے کا عہد

کیا تھا، مگر آپ تو جانتے ہیں کہ میں نے نفسیات پڑھی ہے (اور جہیز میں بھی عملی نفسیات کی کتاب ساتھ لائی ہوں)، اس لیے اپنے کیے ہوئے فیصلے پر قائم نہیں رہ سکتی! اور ہاں، یہ پانچ سو روپے خالہ جان نے مجھے دیے تھے، فی الحال آپ رکھ لیں، جب ضرورت ہو گی لے لوں گی۔ اس کی ان پیاری پیاری نوٹوں میں لپٹی پانچ سو باتوں کا دل پر ایسا اثر ہوا کہ ہم نے ایک بار پھر اس کی اگلی پچھلی تمام خطائیں معاف کر ڈالیں۔

بہر حال زندگی کے کئی سال یوں ہی ہنستے کھیلتے گزر گئے۔ کبھی تو سیاست دانوں کی طرح ایک دوسرے سے یوں ناراض ہو جاتے کہ اپنی وفاداریاں تبدیل کرنے پر غور شروع کر دیتے، اور کبھی اچانک سب کچھ بھول کر غیر مشروط تعاون کی پیش کش کر دیتے، کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ مگر اب جذبات، خدشات میں اور سندیسے، اندیشے میں بدل گئے ہیں، اور محبتیں، صعوبتیں بن گئی ہیں۔ پہلے جب ناراض ہو کر اُس سے منہ پھیر لیتے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے دنیا اس کے لیے بالکل ویران ہو گئی ہو، لیکن اب اگر غصہ کریں تو ہمیں عموماً پہلے ہی راؤنڈ میں چار ایک سے شکست ہو جاتی ہے، کیوں کہ تینوں بچوں کے سہمے سہمے سے ووٹ بھی اسی کی طرف ہو جاتے ہیں۔ نیز آنکھیں، جو پہلے روز چار ہوا کرتی تھیں، اب کبھی فریقین میں سے کسی کو یرقان یا آشوبِ چشم ہو جائے تو معائنے کے لیے ہی چار ہوتی ہیں، ورنہ عام طور پر دو دو ہی رہتی ہیں۔ باتوں کا ردِعمل بھی اب وہ نہیں ہوتا، جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ مثال کے طور پر آج سے بارہ تیرہ سال قبل محض ایک فرضی خط لکھ کر سرھانے رکھ دینے سے اُس کے جذبات میں ایک تلاطم برپا ہو گیا تھا، مگر حال ہی میں باتوں باتوں میں ہماری زبان پھسل گئی اور کسی سے یہ کہہ دیا کہ خاندان میں شادی ہرگز نہیں کرنا چاہیے، تو یہ سنتے ہی وہ آپے سے باہر ہو گئی اور اس موقعے پر جو تاریخی خطبہ دیا، اس کا متن ہم بغیر کسی کمی بیشی کے صرف شوہروں کی عبرت کے لیے جاری کر رہے ہیں:

''خاندان سے باہر کر لی ہوتی۔ کوئی بغیر پڑھی لکھی مل جاتی تو دو دن میں سیدھا کر کے رکھ دیتی۔ میں ہی ہوں جو آپ کو اب تک برداشت کر رہی ہوں، ورنہ جیسی آپ کی عادتیں ہیں، سب کو پتا ہے۔ پھر خاندان میں بھی میرے سوا کوئی اور ڈھنگ کی لڑکی تھی ہی کہاں، جس سے آپ شادی رچاتے (اس لیے کہ سب پہلے ہی رخصت ہو چکی تھیں)۔ میرے تو اچھے خاصے تین رشتے آئے تھے۔ آج وہاں عیش کر رہی ہوتی۔ سب کام نوکر کرتے۔ یہاں تو کم بخت کپڑے بھی خود دھوؤ، کھانا بھی خود پکاؤ (اور پھر خود کھاؤ بھی)، بچوں کو بھی خود ہی دیکھو۔ مجھ سے تو وہ عورتیں لاکھ درجے بہتر ہیں جو آرام سے گھروں میں پڑی رہتی ہیں اور پھر بھی کوئی کام نہیں کرتیں (واضح رہے کہ محترمہ ایک کارپوریشن میں ملازم ہیں)۔ نہ کم بخت گھر ہی ڈھنگ کا ملا، اور نہ شوہر۔ جیسے مکان سے رخصت ہوئی تھی ویسے ہی (بوسیدہ) مکان میں لا کر ڈال دیا۔ کسی کو بلاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ خریدنے کی توفیق نہ تھی تو اتنا بھی نہ ہوا کہ کم از کم کسی اچھے علاقے میں پکا مکان ہی کرائے پر لے لیتے۔ نہ شادی کرنے کا کوئی فائدہ ہوا، نہ ملازمت کرنے کا۔ جیب خرچ تک تو ملتا نہیں، الٹے خالہ جان کے دیے ہوئے پانچ سو روپے بھی غبن کر لیے۔ آخر ہیں نا بینک میں، اپنے گھر کے حسابات درست نہیں ہیں، برانچوں کا آڈٹ کرتے پھرتے ہیں!''

اسی طرح شادی کے ابتدائی دنوں کی بات ہے، ایک روز کہنے لگی کہ جب ہم لوگ بوڑھے ہو جائیں گے تو کیسے لگا کریں گے۔ ہم نے ہنستے ہوئے کہہ دیا کہ بھئی ہم تو بوڑھے نہیں ہوں گے۔ ہمارا جواب سن کر چپ ہو رہی۔ اتفاق سے رات کے کھانے پر پھر یہی بات چل

نکلی، اور ہم نے وہی جواب دیا تو کھانا چھوڑ کر بیٹھ گئی اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنا شروع ہو گئے۔ سمجھایا عقل کے ناخن لو، ہمیں کیا پتا کہ ہماری عمر کتنی ہو گی، رونے سے پہلے ذرا سوچ بھی لیا کرو۔ یہ سنتے ہی اپنی حماقت پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے برعکس کچھ عرصہ قبل تقریباً ایسی ہی بات کہی، تو آنسو تو دور کی بات ہے، چہرے پر ذرا سی ناگواری بھی نہ آئی۔ خلافِ توقع انتہائی سنجیدگی سے بولی، ''بینک میں اپنے واجبات کی وصولی کے لیے تو مجھی کو نامزد کیا ہے نا؟ اپنی وراثت کے فارم میں کسی اور کا نام تو نہیں بھر دیا؟ بچوں کا نام تو ہرگز مت دیجیے گا، اس طرح باپ کے بعد گھر میں ماں کی بھی کوئی حیثیت نہیں رہتی... اور ہاں، فلیٹ تو میرے ہی نام سے خریدا ہے نا؟ یوں بچوں پر رعب قائم رہتا ہے'' (اور کسی کو کچھ دینا بھی نہیں پڑتا)۔

دوستو! دیکھا تماشا یاں کا سب
تم رہو اب، ہم تو اپنے گھر چلے

شادی کے کچھ عرصے بعد اسے گھمانے کے لیے مری لے گئے۔ ہم ہوٹل میں بیٹھے کسی گہری سوچ میں گم تھے (اسے تنگ کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے) اور وہ کھڑکی سے باہر مال روڈ کا نظارہ کر رہی تھی۔ اتنے میں ناشتا آ گیا۔ وہ چائے بنانے لگی تو ہم نے اسے چھیڑتے ہوئے دوسری شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ یقین نہ آیا کہ فرشتے کی بھی مؤنث ہوتی ہے۔ چائے ہماری طرف بڑھاتے ہوئے انتہائی معصومیت سے بولی، ''اب آپ دو کریں یا چار میں تو آپ کی ہو گئی (پھر رونی صورت بناتے ہوئے) ظاہر ہے مجھ میں کوئی کمی ہو گی جبھی تو آپ کے دل میں یہ خیال آیا'' لیکن ابھی کچھ دن پہلے اسی مذاق کا اعادہ کیا تو جس بات پر وہ پہلے مادہ فرشتہ بن گئی تھی، اب اسی بات پر جن کی تانیث بنتے ہوئے یوں گویا ہوئی:

''آپ دو نہیں، تین شادیاں کریں، مگر میں اسی گھر میں رہوں گی، آپ کو یہاں سے جانا ہو گا۔ یہ مکان ہم لوگوں کی وجہ سے کرائے پر ملا تھا۔ آپ کو کراچی میں کون جانتا تھا جو بغیر ایڈوانس لیے اپنا مکان تھما دیتا۔ میں اکیلی رہ سکتی ہوں۔ بچوں کو بھی سنبھال لوں گی (باپ کو نہ سنبھال سکی تو کیا ہوا)۔ آپ سے زیادہ اچھی طرح رکھوں گی۔ ہم لوگوں نے تو ابتدا میں ہی اپنی غلطی کا احساس ہونے پر منگنی توڑ دی تھی، جسے آپ نے بزرگوں سے دباؤ ڈلوا کر زبردستی بحال کرا دیا۔ پتا نہیں، ہمارے گھر والے آپ کی باتوں میں کیوں آ گئے اور آپ کو اُلّو سمجھ کر (خود اُلّو بن گئے)۔ میری شادی کر ڈالی (اپنا اُلّو سیدھا کر لیا) ...... (سانس کا وقفہ) ......ایک بیوی تو سنبھلتی نہیں، اس سے بھی ملازمت کرواتے ہیں، چلے ہیں دو دو کرنے......''

البتہ اتنا عرصہ ساتھ گزارنے کے باوجود اب بھی صنفِ نازک کے ساتھ (خواہ وہ شادی شدہ ہی کیوں نہ ہو) ہمارا کسی قسم کا رابطہ اسے پسند نہیں۔ نیز خالہ جان کے دیے ہوئے پانچ سو روپے اب بھی یاد ہیں، جو منافع لگانے کے بعد پندرہ سو ہو گئے ہیں۔ اکثر کہتی ہے، اگر میں اپنے پیسے آپ کو دینے کے بجائے کسی فنانس کمپنی میں بھی جھونک دیتی تو کم از کم تین چار ماہ تک تو مستقل آمدنی ہوہی جاتی، کم بخت پوری رقم تو نہ ڈوبتی! اس کے علاوہ ایک اور عادت بھی ابھی تک باقی ہے۔ وہ یہ کہ اگر کبھی شام کو گھر پہنچنے میں کچھ تاخیر ہو جائے تو نہ چائے پیتی ہے

اور نہ ہی گھر کا کوئی کام کرتی ہے، بلکہ دروازہ بند کر کے اپنی امی کے ہاں چلی جاتی ہے، یا پھر سو رہتی ہے، اور جب ہم بینک سے واپس لوٹتے ہیں تو نظر پڑتے ہی رونے لگ جاتی ہے۔ ہم اس ادا کو اُس کی محبت کی باقیات سے تعبیر کر کے اب تک دل ہی دل میں خوش ہوتے رہے، لیکن ایک روز کامی نے یہ کہہ کر کہ وہ ہمارے صحیح سلامت واپس آ جانے کی وجہ سے روتی ہوگی، امید کی یہ آخری کرن بھی ختم کر دی!

قصہ مختصر، کل کچھ یوں گفتگو ہوا کرتی تھی کہ آج کھانا وہاں کھائیں گے، چائے وہاں پئیں گے۔ یہاں گھومیں گے، وہاں جائیں گے، مگر اب کچھ یوں ہوا کرتی ہے، مسجد سے واپسی پر دودھ لیتے آیئے گا، عمیر کے بال کٹوانے ہیں، سارہ کی چپل ٹوٹ گئی ہے، حفصہ کے پاس کپڑے ختم ہو گئے ہیں......اور ہاں یہ بجلی اور گیس کے بل بھی آ گئے ہیں اور مالک مکان بھی کرائے کے لیے صبح سے تین چکر لگا چکا ہے

ادھر جغرافیہ بدلا، اُدھر تاریخ بھی بدلی
نہ اُن کی ہسٹری باقی، نہ میری مسٹری باقی

کراچی 1992ء

❁ ❁ ❁

ختم شد

❁ ❁ ❁